دسمبر 56

رجسٹرڈ نمبر ایل ۵۳۴۰

ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ — جلد ۴۷ عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابو الاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

اے ذیلدار پارک، اچھرہ — لاہور پاکستان

چندہ سالانہ چھ روپے — قیمت فی پرچہ دس آنے

خـــالی صفحـــه

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۴۷ | ربیع الثانی ۱۳۷۶ھ مطابق دسمبر ۱۹۵۶ء | عدد ۳

اشارات	ابوالاعلیٰ مودودی	۲
جماعت اسلامی کا موقف اور طریق کار	ابوالاعلیٰ مودودی	۹
اسلامی ریاست	امین احسن اصلاحی	۳۳
محسن انسانیت	نعیم صدیقی	۵۲

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اصلاح و تعمیر کی سعی کرنے والوں کو جن بڑی بڑی برائیوں سے بچنے کی فکر کرنی چاہئے ان میں سے تین کا ذکر پچھلی اشاعت میں کیا جا چکا ہے، یعنی کبر، ریا اور فساد نیت۔ اسلامی عقیدہ و اخلاق کے نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت بنیادی عیوب کی ہے۔ کیونکہ ان میں سے ہر عیب اُس اصل و اساس ہی کو ڈھا دیتا ہے جس پر کسی سعی کے سعیِ خیر اور کسی عمل کے فی سبیل اللہ ہونے کا انحصار ہے۔ اس لیے اُن کا کوئی شائبہ تک ان لوگوں میں نہ پایا جانا چاہیئے جو مسلم معاشرے کی اصلاح اور اسلامی نظامِ زندگی کی تعمیر کا نیک ارادہ لے کر اٹھیں۔

اس کے بعد دوسرا درجہ اُن برائیوں کا ہے جو اساس و بنیاد کو تو نہیں ڈھاتیں مگر اپنی تاثیر کے لحاظ سے کام بگاڑنے والی ہیں، اور اگر تساہل و تغافل برت کر اُن کو پرورش پانے دیا جائے تو تباہ کن ثابت ہوتی ہیں۔ شیطان انہیں ہتھیاروں سے خیر کی راہ مارنے اور انسانی کوششوں کو بھلائی سے برائی کی طرف موڑنے اور معاشرے میں فساد ڈلوانے کا کام لیتا ہے۔ اگرچہ معاشرے کی صحت کے لئے ہر حال میں ان عیوب کا سدِّباب ضروری ہے۔ لیکن خصوصیّت کے ساتھ ان افراد اور جماعتوں کو تو ان سے بالکل پاک رہنا چاہیئے۔ جن کے پیشِ نظر اصلاحِ معاشرہ اور اقامتِ دینِ حق کا مقصدِ عظیم ہو۔

اِس نوعیت کے عیوب کا گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا منبع دراصل، نسان کی بعض مخصوص کمزوریاں ہیں جن میں سے ہر ایک عیوب کے ایک پورے خاندان کو جنم دیتی ہے۔ سہولتِ فہم کے لئے مناسب طریقہ یہ ہوگا کہ ہم ایک ایک کمزوری کو لے کر پہلے اس کی حقیقت کو سمجھیں، پھر یہ دیکھیں کہ وہ کس طرح، کس تدریج سے عیب آفریں بنتی ہے۔ اور نشو و نما پا کر کیا کیا خرابیاں پیدا کرتی ہے۔ اس طرح ہر برائی کا سراہم کو مل جائے گا اور ہم یہ جان سکیں گے کہ اس کی اصلاح کے لئے کس جگہ مرہم تدبیر استعمال کرنا چاہئے۔

انسان کی کمزوریوں میں سے سب سے بڑی اور سخت فساد انگیز کمزوری "نفسانیت" ہے۔ اس کی اصل تو حُبِّ نفس کا وہ فطری جذبہ ہے جو بجائے خود کوئی بُری چیز نہیں بلکہ اپنی حد کے اندر ضروری بھی ہے اور مفید بھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ جذبہ انسان کی فطرت میں اس کی بھلائی کے لئے ودیعت فرمایا ہے تاکہ وہ اپنی حفاظت اور اپنی فلاح و ترقی کے لئے کوشش کرے۔ لیکن جب یہی جذبہ شیطان کی اکساہٹ سے عشقِ نفس اور پرستشِ نفس اور خود مرکزیت میں تبدیل ہو جاتا ہے تو مصدرِ خیر ہونے کے بجائے منبعِ شر بن جاتا ہے اور پھر ہر درجۂ ارتقاء میں اس سے عیوب کا ایک نیا سلسلہ وجود میں آتا چلا جاتا ہے۔

برائی کی طرف اس جذبے کی پیش قدمی کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی اپنی جگہ اپنے آپ کو بے عیب اور مجموعۂ محاسن سمجھ بیٹھتا ہے، اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا احساس کرنے سے اغماض برتتا ہے۔ اور اپنے ہر نقص یا قصور کی تاویل کر کے اپنے دل کو مطمئن کر لیتا ہے کہ میں ہر لحاظ سے بہت اچھا ہوں۔ یہ خود پسندی پہلے ہی قدم پر اُس کی اصلاح و ترقی کا دروازہ اُس کے اپنے ہاتھوں سے بند کرا دیتی ہے۔

پھر جب یہ "من چہ خوب" کا احساس لئے ہوئے آدمی اجتماعی زندگی میں آتا ہے تو اُس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ اُس نے اپنے آپ کو فرض کر رکھا ہے وہی کچھ دوسرے بھی اُسے سمجھیں وہ صرف تعریف و تحسین سُننا چاہتا ہے۔ تنقید اُسے گوارا نہیں ہوتی۔ خیر خواہانہ نصیحت تک سے اس کی خودی کو ٹھیس لگتی ہے۔ اس طرح یہ شخص اپنے لئے داخلی وسائلِ اصلاح کے ساتھ خارجی وسائلِ اصلاح کا بھی سدِّ باب کر لیتا ہے۔

مگر کوئی شخص بھی دُنیا میں ایسا نہیں ہو سکتا جس کو اجتماعی زندگی میں ہر لحاظ سے اپنی خواہش اور اپنی پسند ہی کے مطابق حالات مل جائیں۔ خصوصیت کے ساتھ خود پسند اور خود پرست آدمی کو تو یہاں ہر طرف سے چرکے لگتے ہیں۔ کیونکہ اس کی خودی اپنے اندر وہ اسباب لئے ہوئے آتی ہے جو معاشرے کی بے شمار خودیوں کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر کرا دیتے ہیں اور معاشرے کے مجموعی حالات بھی اس کی توقعات و خواہشات سے خواہ مخواہ ٹکراتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس شخص کو صرف اس

حد پر نہیں رہنے دیتی کہ وہ بس اپنی اصلاح کے داخلی وخارجی وسائل سے محروم ہوکر رہ جائے بلکہ دوسروں سے تصادم کے بڑے اور توقعات کی شکست کے صدمے اس کی مجروح خودی کو پیہم ایک سے ایک شدید تر برائی میں مبتلا کرتے چلے جاتے ہیں۔ وہ بہت سے لوگوں کو زندگی میں اپنے سے بہتر پاتا ہے۔ بہت سے لوگوں کے متعلق وہ محسوس کرتا ہے کہ معاشرہ ان کو اس سے زیادہ وقعت دے رہا ہے۔ بہت سے لوگ اس کو وہ وقعت نہیں دیتے جس کا وہ طالب ہوتا ہے بہت سے لوگ اس کے ان مراتب تک پہنچنے میں مانع ہوتے ہیں جن کا وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتا ہے بہت سے لوگ اس پر تنقید کرتے ہیں، بلکہ اس کی تنقیص تک کر ڈالتے ہیں۔ یہ مختلف حالات اس کے دل میں کسی کے خلاف حسد کی، اور کسی کے خلاف بغض اور کینے کی آگ بھڑکا دیتے ہیں۔ وہ دوسروں کے حالات کا تجسّس کرتا ہے۔ دوسروں کے عیب ڈھونڈتا ہے۔ غیبتیں کرتا ہے اور غیبتیں سُن کر لذّت لیتا ہے۔ چغلیاں کھاتا ہے۔ نجویٰ اور سرگوشیاں اور سازشیں کرتا پھرتا ہے۔ اور اگر اس کے اخلاق کی بندشیں ڈھیلی ہوں۔ یا ان مشاغل میں پیہم مشغول رہنے سے ڈھیلی ہوجائیں تو پھر ان گناہوں سے آگے بڑھ کر جھوٹ افترا، بہتان اور دوسرے قبیح تر جرائم کا ارتکاب کرنے لگتا ہے۔ ان برائیوں کے چکر میں پھنس کر وہ اخلاق کی انتہائی پستیوں تک پہنچنے سے نہیں بچ سکتا۔ اِلّا یہ کہ کسی مرحلے پر پہنچ کر اسے خود ہی اپنی اس ابتدائی غلطی کا احساس ہوجائے جس نے اسے اس راستے پر ڈالا تھا۔

یہ کیفیت اگر کسی ایک ہی شخص کی ہو تو اس سے کوئی اجتماعی فساد رونما نہیں ہوتا۔ اس کا اثر زیادہ سے زیادہ چند اشخاص تک پہنچ کر رہ جاتا ہے۔ لیکن اگر اسی نفسانیت کے بہت سے مریض موجود ہوں تو ان کے سبب سے پوری اجتماعی زندگی میں فساد پھیل جاتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں آپس کی بدظنّی، تجسّس، عیب چینی، غیبت اور چغل خوری کا ایک سلسلہ چل رہا ہو۔ جہاں بہت سے لوگ دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف بُرائی پال رہے ہوں اور بغض وحسد کی بنا پر ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہوں۔ اور جہاں

بہت سی مجروح نہ دیاں انتقام کے جذبات سے لبریز ہوں، وہاں پھوٹ پڑے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہاں کوئی چیز دھڑے بندیوں کو نہیں روک سکتی۔ وہاں کسی تعمیری تعاون تو درکنار، تعلقات کی خوشگواری تک کا امکان باقی نہیں رہتا۔ ایسے ماحول میں کشیدگی اور کشمکش ناگزیر ہے اور وہ صرف نفسانیت کے مریضوں تک ہی محدود نہیں رہتی بلکہ رفتہ رفتہ اچھے خاصے نیک نفس لوگ اس میں مبتلا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ ایک نیک نفس آدمی منہ پر تو بجا تنقید ہی نہیں بے جا تنقید کو بھی گوارا کر سکتا ہے مگر غیبت اس کے دل میں غبار پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ اور اس کا کم سے کم اتنا اثر تو ہوتا ہی ہے کہ غیبت کرنے والوں پر اعتماد کرنا اس کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ اس طرح ایک نیک نفس آدمی اُن سب زیادتیوں کو معاف کر سکتا ہے جو بغض یا حسد کی بنا پر اس کے ساتھ کی جائیں۔ وہ بدگوئی، الزام تراشی، جھوٹے پروپیگنڈا اور اس سے بھی زیادہ اذیت بخش چیزوں کو بھی نظر انداز کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ جن لوگوں سے ان صفات کا ذاتی تجربہ اس کو ہو چکا ہو اُن سے وہ اطمینان کے ساتھ کوئی معاملہ کر سکے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جس اجتماعی ماحول میں یہ عیوب برروئے کار آجاتے ہیں۔ وہ کس طرح شیطان کی من بھاتی چراگاہ بن کر رہتا ہے۔ حتیٰ کہ اس میں بہتر سے بہتر آدمی بھی چاہے کشمکش سے بچ جائیں۔ کشیدگی سے نہیں بچ نہیں رہ سکتے۔

اس کے بعد یہ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ جو لوگ اصلاح و تعمیر کے لئے مل کر اجتماعی جدوجہد کرنا چاہتے ہوں ان کی جماعت کا ان امراض سے پاک ہونا کس قدر ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نفسانیت کے جراثیم ایسی جماعت کے لئے طاعون اور ہیضے کے جراثیم سے زیادہ خطرناک ہیں۔ ان کی موجودگی میں کسی تعمیر صالح کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

شریعتِ الٰہی اِس مرض کے مبدأ آغاز سے اس کا علاج شروع کرتی ہے اور پھر ہر مرحلے پر اس کے سدِّباب کے لئے ہدایات دیتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں جگہ جگہ اہلِ ایمان کو توبہ و استغفار کی جو تلقین کی گئی ہے اُس کا منشا یہی ہے کہ مومن کسی وقت بھی اعجابِ نفس اور خود پسندی میں مبتلا نہ ہو۔ کبھی اپنے آپ کو بڑی چیز نہ سمجھے۔ ہر وقت اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا احساس اور اپنی خطاؤں اور لغزشوں کا اعتراف ہی کرتا رہے اور بڑے

سے بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد بھی اُس پر پھولنے کے بجائے عاجزی کے ساتھ اپنے خدا کے حضور یہی درخواست پیش کرے کہ خدمت میں جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں اُن سے درگزر فرمایا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر مجموعۂ کمالات اور کون ہو سکتا ہے۔ اور آپ سے بڑا کارنامہ دنیا میں کس انسان نے انجام دیا ہے۔ مگر تاریخ کے اس عظیم ترین کارنامے کو انتہا تک پہنچا کر جب آپ فارغ ہوئے تو دربارِ الٰہی سے جو تلقین آپ کو فرمائی گئی وہ یہ تھی کہ

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا"

جب اللہ کی مدد آگئی اور فتح نصیب ہو گئی اور تم نے لوگوں کو اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہوتے دیکھ لیا تو اب اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اور اس سے مغفرت چاہو۔ یقیناً وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔

یعنی جو کارِ عظیم تم نے انجام دیا اس کے متعلق تم یہ سمجھو کہ اس کی تعریف تمہیں نہیں بلکہ تمہارے رب کو پہنچتی ہے جس کے فضل و کرم سے تم اتنا بڑا کام کر دکھانے میں کامیاب ہوئے۔ اور اپنے متعلق تمہارا احساس یہی ہونا چاہیئے کہ جو حق خدمت تھا وہ پھر بھی ادا نہ ہوا۔ اس لئے انعام مانگنے کی بجائے اپنے رب سے یہ التجا کرو کہ خدمت میں جو کچھ کسر رہ گئی ہے اس سے درگزر فرمائیے۔ چنانچہ بخاری مسلم میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یکثر ان یقول قبل موتہ سبحان اللہ وبحمدہ استغفر اللہ واتوب الیہ"۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی وفات سے پہلے اکثر یہ فرمایا کرتے تھے کہ میں اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتا ہوں۔ اور اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اور اس کے حضور توبہ کرتا ہوں۔ اور ویسے بھی توبہ و استغفار ہمیشہ ہی آنحضور کا معمول تھا۔ بخاری میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ہے کہ انہوں نے حضور کو فرماتے سنا کہ واللہ انی استغفر اللہ واتوب الیہ فی الیوم اکثر من سبعین مرۃ"۔ خدا کی قسم میں ہر روز ستر مرتبہ سے زیادہ اللہ سے استغفار اور توبہ کرتا ہوں۔

اس تعلیم کی روح اگر کوئی شخص اپنے اندر جذب کرے تو اس کے ذہن میں نفسانیت کا وہ بیج کبھی جڑ ہی نہیں پکڑ سکتا۔ جو برگ و بار لا کر فتنہ و فساد کے بس بھرے پھل دیتا ہے۔

اس پر بھی اگر کسی نفس میں یہ خرابی پیدا ہو ہی جائے تو شریعت الٰہی اخلاق اور عملی رویے میں اس کے ظہور اور نشوونما کو ہر قدم پر روکتی ہے۔ اور اس کے بارے میں سخت احکام دیتی ہے۔ مثلاً اس کا پہلا ظہور اس شکل میں ہوتا ہے۔ کہ آدمی اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھتا اور منوانے کی کوشش کرتا ہے اور اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ کوئی شخص اسے کسی غلطی پر ٹوکے۔ شریعت الٰہی اس کے برعکس امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تمام اہل ایمان پر لازم کرتی ہے۔ اور خاص طور پر ذی اقتدار ظالموں کے مقابلے میں کلمہ حق کہنے کو تو افضل الجہاد قرار دیتی ہے تاکہ مسلم معاشرے میں برائی پر ٹوکنے اور بھلائی کی تلقین کرنے کا ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں نفسانیت پنپ ہی نہ سکے۔

اس کا دوسرا ظہور بغض و حسد کی شکل میں ہوتا ہے۔ جسے آدمی ہر اس شخص کے خلاف دل میں پالنا شروع کرتا ہے۔ جس سے اس کی نفسانیت کو چوٹ لگی ہو۔ اور پھر اس سے تعلقات کی خرابی کا آغاز ہوتا ہے۔ شریعت الٰہی اس چیز کو گناہ قرار دیتی ہے۔ اور اس پر سخت وعید سناتی ہے۔ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ایاکم والحسد فان الحسد یاکل الحسنات کما تاکل النار الحطب۔ "خبردار حسد نہ کرو۔ کیونکہ حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو چٹ کر جاتی ہے۔" احادیث میں متعدد الفاظ کے ساتھ حضور کے یہ تاکیدی ارشادات وارد ہوئے ہیں۔ کہ لاتباغضوا (ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو) لا تحاسدوا (ایک دوسرے سے حسد نہ کرو) لا تدابروا (ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو)۔ لا تقاطعوا (ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو) لا یحل لمسلم ان

لا تقاطعوا (ایک دوسرے سے قطع تعلق نہ کرو) لا یحل لمسلم ان

یھجر اخاہ فوق ثلاث (کسی مسلم کے لئے حلال نہیں ہے۔ کہ تین دن سے زیادہ اپنے مسلمان بھائی سے تعلقات توڑے رکھے

اس کا تیسرا قدم بدگمانی کی طرف اٹھتا ہے اور پھر تجسس کر کر کے آدمی دوسروں کے عیوب ٹٹولنے لگتا ہے۔ بدگمانی کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی اپنے سوا ہر ایک سے متعلق یہ ابتدائی مفروضہ قائم کرتا ہے کہ وہ ضرور برا ہے اور بظاہر اس کی جو چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اس کی کوئی اچھی توجیہہ کرنے کے بجائے ہمیشہ بری توجیہہ کرتا ہے اور تحقیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھتا۔ تجسس اسی بدگمانی کا ایک شاخسانہ ہے۔ آدمی دوسروں کے متعلق پہلے بری رائے قائم کرتا ہے۔ پھر اس کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے ان کے حالات کی ٹوہ لگانی شروع کرتا ہے۔ قرآن ان دونوں چیزوں کو گناہ قرار دیتا ہے۔ سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا "بہت گمان کرنے سے بچو کیونکہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ اور تجسس نہ کرو"۔ حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ایاکم والظن فان الظن اکذب الحدیث "خبردار، بدگمانی نہ کرو کیونکہ بدگمانی بدترین جھوٹ ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ انا قد نہینا عن التجسس ولکن ان یظہر لنا شئ ناخذ بہ ہم کو ٹوہ لگانے اور عیوب ٹٹولنے سے منع کیا گیا ہے۔ البتہ اگر ہمارے سامنے کوئی بات کھل جائے تو اس پر ہم پکڑیں گے"۔ حضرت معاویہؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انک ان اتبعت عورات المسلمین افسدتہم "اگر تم مسلمانوں کے پوشیدہ احوال کی کھوج کرید کرو گے تو ان کو بگاڑ دو گے"۔

ان مراحل کے بعد غیبت کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد خواہ بدگمانی پر ہو، یا حقیقت پر، دونوں حالتوں میں کسی شخص کو ذلیل کرنے اور اس کی تذلیل سے لذت یا فائدہ اٹھانے کی خاطر اس کے پیٹھ پیچھے اس کی برائی کرنا غیبت ہے۔ حدیث میں اس کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ ذکرک اخاک بما یکرہ "تیرا اپنے بھائی کی غیر موجودگی میں اس کا ذکر اس طرح کرنا کہ اسے معلوم ہو تو ناگوار ہو"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اگر ہمارے بھائی میں وہ برائی موجود ہو جس کا ذکر کیا

(بقیہ بر صفحہ ۶۰)

سید ابوالاعلیٰ مودودی

جماعت اسلامی کے موقف اور طریق کار کے متعلق

بعض اہم توضیحات

یہ مضمون دراصل دو اہم مکتوبات اور ان کے جوابات پر مشتمل ہے۔ مکتوبات میں جماعت اسلامی پاکستان کے ایک ہمدرد کی طرف سے جماعت کے طریق کار اور موقف کے متعلق بعض اہم سوالات اٹھائے گئے ہیں جواب میں مدیر ترجمان کی طرف سے جو توضیحات کی گئی ہیں وہ بھی غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ امید ہے کہ ان سے قارئین کو جماعت کی اس پالیسی کو سمجھنے میں بہت مدد ملے گی جس پر تقسیم کے بعد سے اب تک جماعت اسلامی کاربند رہی ہے۔

مکتوب اوّل

"اگرچہ میں جماعت کا رکن نہیں ہوں، تاہم اس ملک میں مغربیت کے الحادی مضرات کا جماعت جس طرح مقابلہ کر رہی ہے۔ اس نے مجھے بہت کچھ جماعت سے وابستہ کر رکھا ہے اور اسی وابستگی کے جذبہ کے تحت اپنی ناقص آرا پیش کر رہا ہوں۔

بین الاقوامی سطح پر، آج جو شدید ہلچل مچی ہوئی ہے، اس نے پورے عالم انسانیت کو ہلاکت و تباہی کے جہنم کے کنارے لا کھڑا کیا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ آنے والا کل اپنے دامن میں کتنے خوفناک طوفان سمیٹے ہوئے آ رہا ہے۔ ایسے خطرناک اور نازک موقعہ پر، اسلام کے نام سے جو کچھ سوچا اور کہا جائے، حق و باطل کے درمیان پوری پوری تمیز و تفریق کے ساتھ سوچا اور سمجھا جانا چاہیے نہ ظالم و مظلوم کے معاملہ میں محدود جذبات، تنگ نظریات اور وقتی مصلحت اندیشیوں سے مقصد حق کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اسلام کی عمومیت، عالم گیریت اور پوری انسانیت کو زیر سایہ لے لینے کی اہلیت کے اظہار میں کسی قسم کا ذرا سا بھی تحمل و تساہل، اسلام کے مقصد کے لیے مضر ترین ثابت

ہو سکتا ہے۔

پاکستان میں دستور و انتخاب کا مسئلہ بھی از سرِ نو قابلِ غور ہے اور نہایت احتیاط و تدبر سے کسی نتیجہ و فیصلہ پر پہنچنے کی ضرورت ہے اس لیے کہ موجودہ دستور اپنی پوری ہئیت ترکیبی کے لحاظ سے قطعی طور پر اسلام کی حقیقی بالادستی کو تسلیم نہیں کرتا، کتاب و سنت سے ثابت شدہ متفق علیہ احکام کا اجراء و نفاذ بھی موجودہ دستور کی رو سے، لیجسلیچر اور صدر مملکت کی منظوری کا محتاج ہے قطع نظر اس بات کے کہ ایسی صورت میں، قوانین الٰہیہ بھی' انسانی آراء کی منظوری کے محتاج بن جاتے ہیں' سخت اندیشہ ہے کہ تعبیرات کی تبدیلی سے، بہت سے وہ کام جو اسلام کی نظر میں اب تک ناجائز نہیں رہے ہیں، اس ملک کی تعزیرات میں، جرائم کی فہرست میں شامل ہو جائیں، اور بہت سے وہ کام جنھیں اسلام قطعاً پسند نہیں کرتا مباحات کی فہرست میں داخل کر دئے جائیں۔ موجودہ دستور نے قرآن و سنت کو ایک طرف اسمبلی کی کثرت آراء کی منظوری و تعبیر فرمائی کا تابع بنا دیا ہے، دوسری طرف صدر مملکت کی رضامندی' اور دستخطوں کا پابند بنا دیا ہے اور تیسری طرف عدالتوں کی تشریح و توضیح کا محتاج بنا دیا ہے۔ حالانکہ پورے دستور میں' صدر مملکت، ارکان وزارت، ارکان اسمبلی اور ارکان عدالت کی اسلامی اہلیت کے لیے ایک دفعہ بھی بطور شرط لازم نہیں رکھی گئی ہے اور ان کے لیے اسلامی علم و تقویٰ کے معیار کو سرے سے ضروری سمجھا ہی نہیں گیا ہے نہ ایسی صورت میں اس دستور کا اسلامی دستور کہنا و سمجھنا ہی قابل اعتراض ہے کجا یہ کہ اسے قبول کرنا اور قابلِ عمل بنانا۔

مخلوط انتخاب سے پاکستان کی وہ حیثیت تو بلاشبہ کمزور ہو جاتی ہے، جسے اسلام کے نام سے نمایاں کیا گیا ہے، لیکن جداگانہ انتخاب سے' سوائے مسلم قوم پرستی کے اور کیا حاصل ہو سکتا ہے، اسلام کے حق میں تو ایسا جداگانہ انتخاب قطعی بے معنیٰ بلکہ نقصان رساں ہے، جس کے بعد بھی، اسمبلی میں مسلم و غیر مسلم دونوں کو مساوی حق رائے دہی حاصل ہو، اسمبلی کا صدر نائب صدر، مسلم و غیر مسلم دونوں بن سکتے ہوں' نمائندہ وزارت میں دونوں لیے جا سکتے ہوں، اور احکام اسلامی کی توضیح و تنقید، اتفاق و اختلاف آراء اور ووٹنگ میں کلمہ گو اور غیر کلمہ گو دونوں یکساں طور پر حصہ لے سکتے ہوں۔ ایسی صورت میں

اسلام کو کوئی حقیقی فائدہ پہنچنے کے بجائے ، اسلام کی عمومیت و عالمگیریت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے ۔ اسلام کا دوسروں کے مقابلہ میں فریقِ جنگ بن جانے کا خطرہ ہے ۔ غیر مسلم قومیں خواہ مخواہ اُسے اپنا سیاسی و معاشی حریف سمجھنے لگیں گی ۔ غیر مسلموں کے دل اسلام کی طرف سے اور مقفل ہو جائیں گے ۔ ملک میں دوسری قوموں سے کشمکش زیادہ سے زیادہ بڑھ ہی جائے گی اور ہو سکتا ہے کہ آئندہ چل کر پاکستان میں ، اسلام بھی ، بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں کا قومی مذہب بن کر رہ جائے ۔ اگر مسلمانوں کی پوزیشن اس ملک میں وہی رہے جو آج ہے ، تو کوئی حقیقی اسلامی فائدہ حاصل ہونے کی توقع نہیں کی جا سکتی ہے ۔

ان معروضات میں اگر کوئی وزن اور حقیقت محسوس فرمائی جائے تو میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ضرور اس پر غور فرمائیں اور ان نازک مواقع پر ملت اسلامیہ کی صحیح صحیح رہبری فرمانے سے دریغ نہ کیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اسے صحیح طور پر انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے اور مسلمانوں کے دل آپ کی حمایت و اعانت کے لیے کھول دے ۔"

جواب

آپ کے قیمتی خیالات قابلِ غور اور مفید مشورے لائقِ شکریہ ہیں ۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جماعت سے دلچسپی رکھنے والے طبقے میں ایسے صاحبِ فکر لوگ موجود ہیں جو خود اپنی جگہ بھی معاملات پر غور کرتے ہیں اور اپنے مشوروں سے ہماری مدد کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے ۔

آپ نے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے ان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم اپنی تحریک خلاء میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں ۔ اگر ہمارا مقصد محض اعلان و اظہارِ حق ہوتا تو ہم غیر ذرد صرف بے لاگ حق بات کہنے پر اکتفا کرتے لیکن ہمیں چونکہ حق کو قائم بھی کرنے کی کوشش کرنی ہے اور اس کی اقامت کے لیے اِسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہے اس لیے ہمیں نظریت (IDEALISM) اور حکمتِ عملی (PRACTICAL WISDOM) کے درمیان توازن برقرار رکھتے ہوئے چلنا پڑتا ہے ۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے آخری مقصود کو نہ صرف خود پیشِ نظر رکھیں بلکہ دنیا کو بھی اسی کی طرف ،

بلاتے اور رغبت دلاتے رہیں۔ اور حکمت عملی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے مقصود کی طرف تدریج بڑھیں اور واقعات کی دنیا میں ہم کو جن حالات سے سابقہ ہے ان کو اپنے مقصد کی طرف موڑنے، اس کے لیے مفید بنانے اور مزاحمتوں کو ہٹانے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس غرض کے لیے ہمیں اپنے آخری مقصود کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے جائیں۔

مثال کے طور پر بین الاقوامی دنیا میں ہمارا آخری مقصود ایک عالمگیر مثالی اسلامی ریاست ہے۔ اس کے راستے میں ایک طرف مغربی استعمار، اور روسی اشتراکیت بڑی عظیم رکاوٹیں ہیں۔ دوسری طرف مسلمان قوموں کی موجودہ حالت بڑی رکاوٹ ہے۔ ان رکاوٹوں کو دُور کرنا ہمارے درمیانی مقاصد میں شامل ہے۔ مسلمان ریاستوں کی باہمی پھوٹ، ان کا مختلف بلاکوں میں بٹ جانا، ان کے اندر وطنی نیشنلزم کا پیدا ہونا، اور ان میں لادینی نظریات پر حکومتیں قائم ہونا، یہ سب ہمارے راستے میں حائل ہیں، اور ان سب سے ہمیں عہدہ برا ہونا ہے۔ اس غرض کے لیے اگر ہم کبھی کسی قریبی مقصود کے لیے کوئی بات کہیں یا کریں تو آپ کو یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ ہم نے اپنے آخری مقصود کو چھوڑ دیا ہے، یا اس کے خلاف کوئی بات کی ہے۔

اسی طرح دستور اسلامی کے بارے میں جو باتیں آپ نے لکھی ہیں ان میں سے کوئی بھی ہم سے پوشیدہ نہیں ہے نہ کبھی پوشیدہ تھی لیکن یہاں ایک کھلی کھلی لادینی ریاست کا قائم ہو جانا ہمارے مقصد کے لیے اس سے بہت زیادہ نقصان دہ ہوتا جتنا اب اس نیم دینی نظام کا نقصان آپ کو نظر آرہا ہے۔ بلاشبہ ہم نے پوری چیز حاصل نہیں کی ہے، مگر کشمکش کے پہلے مرحلے میں ہم نے اتنا فائدہ ضرور حاصل کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دیا، اور اسلام کی چند ایسی بنیادی باتیں منوالیں جن پر آگے کام کیا جاسکتا ہے۔ ہم اس غلط فہمی میں نہیں ہیں کہ ہمارا مقصود حاصل ہو گیا ہے۔ ہم اس مقام پر ٹھیر جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ بلکہ جو کچھ ہم نے حاصل کیا ہے اسے مزید مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہتے ہیں اور اب ہم پیش قدمی کے لیے اُس سے بہتر پوزیشن میں ہیں جو اس قریبی مقصود کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں ہماری ہوتی۔

طریقِ انتخاب کے بارے میں بھی آپ نے ہمارے نقطۂ نظر کو اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ میں نے اپنے پمفلٹ "مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں" کے آخری حصہ میں جو کچھ عرض کیا ہے اسے پھر بغور ملاحظہ فرمائیں، اور خود بھی غور کریں کہ اگر مخلوط انتخاب اپنے وطنی قومیت کے نظریے اور لادینی پس منظر کے ساتھ رائج ہو تو وہ ہمارے آخری مقصود کی راہ میں زیادہ رکاوٹ ہوگا یا جداگانہ انتخاب اُن قباحتوں کے ساتھ جن کی آپ نشان دہی کر رہے ہیں، زیادہ رکاوٹ ثابت ہوگا، نیز یہ کہ جداگانہ انتخاب سے پیدا ہونے والی قباحتوں کو رفع کرنا زیادہ آسان ہے یا مخلوط انتخاب کی قباحتوں کو۔ ان امور پر غور کر کے آپ خود ایک رائے قائم کریں اور اس بات کو نہ بھولیں کہ ہمارا آخری مقصود کبھی ہماری نگاہ سے اوجھل نہیں ہوا ہے۔ ہمیں بڑھنا اسی کی طرف ہے، مگر درمیانی مقاصد کو حاصل کرتے ہوئے اور راہ کی رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے ہی ہم آگے بڑھ سکتے ہیں۔ دفعۃً چھلانگ لگا کر پہنچ جانا ممکن نہیں ہے۔

مکتوب ثانی

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے میری معروضات پر توجہ فرمائی اور انہیں قابلِ التفات سمجھا۔ آپ کے حوصلہ افزا جواب کے بعد، اس سلسلہ میں چند اور گذارشات آپ تک پہنچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسے خدانخواستہ تحریری مباحثہ نہ تصور فرما لیا جائے، بلکہ یہ ایک ایسے شخص کے افکار پریشاں ہیں، جو سالہا سال سے مسلمانوں کی سیاست اور عالمی پیچیدگیوں کا طالب علمانہ مطالعہ کرتا چلا آرہا ہے، اور اس بات کو اپنا ایمان و یقین تصور کرتا ہے کہ اسلام ہی، انسانیت کا دنیا و آخرت میں واحد ذریعۂ نجات ہے۔

اگر انتخابات سے ہمارا آخری مقصود یہی ہے کہ موجودہ، نیم دینی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے، اور دستور کے اسلامی تقاضوں کو، بغیر کسی تحریف کے صحیح طور پر پورا کیا جاسکے، تو اس کے لیے پہلا اور زیادہ بہتر طریقہ یہی تھا کہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والے، اہل تقوے اور اہل بصیرت، مسلمانوں پر مشتمل 'لیجسلیچر' کا قیام عمل میں لایا جائے اور براہ راست اس کے لیے جدوجہد کی جاتی رہے۔ بالخصوص ایسے وقت میں اس براہ راست

کوشش کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے، جب کہ ملک بھر میں، مختلف و متضاد طبقے، دستور کے نام پر، اسلام کی عجیب و جدید تعبیر کرنے میں لگے ہوئے ہیں، لیکن جماعت کے اہل الرائے حضرات کی اکثریت اگر اسے مناسب نہیں سمجھتی ہے، تو پھر جداگانہ اور مخلوط طریق انتخاب کے درمیان پوری توجہ کے ساتھ تمیز کی جانی چاہیے کہ کونسا طریقہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے زیادہ آسان اور اقرب الی الصواب ہے۔

جداگانہ انتخاب کے ساتھ مسلمانوں کی وابستگی، نفسیاتی وابستگی ہے، جو گذشتہ پچاس ساٹھ سال سے برابر چلی آرہی ہے۔ جداگانہ انتخاب، الیکشن میں بطور نمائندگی کے، ہندوؤں کی عددی اکثریت کے مقابلہ پر وجود میں آیا تھا، اور بدقسمتی سے یہ مسلمانان ہند کی سیاست کا واحد شاہکار بن کر رہ گیا، اب اگر اس ذریعہ کو، اسلامی دستور کے مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان میں استعمال کیا گیا، تو بوجوہ ذیل ان مقاصد کا حاصل کرنا نہایت مشکل ہو جائے گا۔

اولاً اس صورت میں، اسلامی پروگرام رکھنے والے فریق کی بہ نسبت، اسلامی نام اور غیر مسلموں کی مخالفت کے نعروں اور سنسنیوں سے ووٹروں کو اپیل کرنے والا فریق ہمیشہ پیش پیش رہے گا۔ جیسا کہ گذشتہ پچاس سال سے وہ پیش پیش رہتا چلا آرہا ہے۔ اس فریق نے پہلے بھی، اسلام کا مقدس نام اپنی خواہشات کے لیے استعمال کیا اور اسلام کی غلط نمائندگی کی۔ آج بھی اس کی ذہنیت اور عملی زندگی بدستور سابق ہے، اور پہلے کی بہ نسبت، کامیابی کے ذرائع آج اس کے پاس بہت زیادہ ہیں۔

ثانیاً۔ مسلمان کثرت تعداد کے باوجود، خود غرض سیاست دانوں کی دانش فریبیوں کے ہاتھوں غیر مسلموں کے مقابلہ میں، خوف و احساس کہتری کی ہسٹریائی کیفیت میں بآسانی مبتلا رکھے جائیں گے۔

ثالثاً مسلمان رائے دہندوں کے سامنے، اپنے حقوق سے تعلق رکھنے والے مسلمان امیدواروں کو کامیاب بنا دینا ہی، اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ بن کر رہ جایا کرے گا۔

رابعاً مسلم حلقوں میں، ایک سے زیادہ مسلمان امیدواروں کے درمیان اسلام کے نام پر جو کشمکش برپا کی جاتی رہے گی، وہ بجائے خود اسلام اور مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوسکتی ہے۔

خامساً، غیر مسلم حلقے زیادہ سے زیادہ متحد ہوتے رہیں گے اور آگے چل کر وہ ایک ایسا متحدہ بلاک بن سکتے ہیں، جو غیر ملکی طاقتوں کا آلہ کار ہوسکتا ہے اور جس کی ہمدردی میں غیر ملکی طاقتیں معاملات میں ایسی مداخلتیں کرسکتی ہیں جن سے ملک میں اعصابی جنگ اور کشمکش جاری رہے۔

سادساً، آئندہ خطرہ ہے کہ ملک کی اس فرقہ وارانہ سیاست میں، اسلام کی حیثیت ثانوی نہ رہ جائے، اسلام کی معمولی دعوت کے امکانات کم سے کم نہ ہوتے جائیں، اور ملک کے اندر باہر غیر مسلم حلقے، اسلام کے مستقل حریف نہ بنتے جائیں۔

سابعاً، غیر اسلامی ملکوں میں، اسلام کے قیام کے لیے کام کرنے والوں کے واسطے یہ ایک ایسی مثال ہوگی، جس سے ان کی مشکلات میں بے اندازہ اضافہ ہوجائے گا، اور وہ غیر مسلم اقوام و عوام کو، انسانیت کی سطح پر اپیل کرنے کی پوزیشن میں ہرگز نہیں رہیں گے۔

اور آخر میں یہ کہ ہمارے اس ملک میں اہل ثروت و اہل ریاست کو جو اثر حاصل ہے اور جس طرح وہ فسق و فجور کی امامت میں پیش پیش ہیں، جداگانہ انتخاب کے بعد ان کے ہاتھ اور مضبوط ہوجائیں گے ان کے حلقے، الیکشن کے لیے، جس طرح آج ان کی بلا شرکت غیرے میراث بنے ہوئے ہیں جداگانہ انتخاب سے وہ مستحکم تر ہوتے چلے جائیں گے۔ اب یا تو ان کی ثروت و ریاست ختم ہو، یا ان کے مزاج اسلامی بنیں اور یہ دونوں چیزیں اللہ کی خاص مہربانی سے ہی ممکن ہیں، بندوں کے اختیار و تدبیر سے مشکل ہیں۔

اس کے برخلاف مخلوط انتخاب کی صورت میں، جسے بجائے مخلوط کے، عمومی انتخابات کہنا زیادہ موزوں ہوگا، پارٹی پروگرام پر کامیابی کی بنیاد رہ جائے گی۔ اگرچہ اس وقت اسلام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کو پوری پوری تن دہی اور جانفشانی سے کام لینا ہوگا لیکن وہ اسلام کو پارٹی پروگرام بنا کر، اول تو ملک کے تمام باشندوں کو اپیل کرنے کی پوزیشن میں آجائے گی، دوسرے یہ کہ وہ اس پروگرام کو نظری

طور پر بین الاقوامی تحریک کی پوزیشن میں لا سکے گی، اور اسلام کے لیے، اسلامی اور غیر اسلامی ممالک میں کام کرنے والوں کے درمیان نقطہ اتحاد کا کام دے سکے گی۔ تیسرے یہ کہ مقابلہ اشخاص سے اشخاص کا نہیں رہے گا بلکہ جماعتوں کے اصول اور پروگرام کا ایک دوسرے سے مقابلہ ہوگا، ہم اسلام کے اصول اور پروگرام کو لے کر پوری قوم اور پورے ملک کے پاس جائیں گے۔ اس طرح اصول اور پروگرام پر، دوسرے خود غرض اور مفاد پرست گروہوں سے کھلا ہوا آزادانہ اور مساویانہ مقابلہ ممکن ہو سکے گا۔ اور چوتھے یہ کہ جب بھی اسلامی جماعت کامیاب ہوگی، دوسرے عناصر کے تعاون کی محتاج ہوئے بغیر نہایت آسانی سے ملک کی پوری ہیئت ترکیبی کو، اسلامی قالب میں تبدیل کر سکے گی، اور ایک مثالی اسلامی ریاست کا نمونہ پیش کرنے کے قابل بن سکے گی۔ آپ کے پمفلٹ "مخلوط انتخاب کیوں اور کیوں نہیں" میں اس حیثیت سے، مسئلہ انتخاب کا تجزیہ نہیں کیا گیا ہے۔ میں گذارش کروں گا آپ ان پہلوؤں پر بھی غور فرمائیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مخلوط انتخاب کے موجودہ حامیوں کے ساتھ میں ہرگز متفق نہیں ہوں، اس لیے کہ ان کا مقصد اس سے ایک ایسی پاکستانی نیشن بنانا ہے جس میں نہ کوئی مسلمان مسلمان رہے اور نہ کوئی ہندو ہندو، جب کہ میرا مقصد اس سے پاکستان میں ایک ایسی نیشن بنانا ہے جو خالص مسلمان ہی مسلمان ہو۔ اگر سوء تدبیر سے، مخلوط انتخاب کو اول مقصد کے لیے ذریعہ بنایا گیا تو یقیناً میرا تعاون، جداگانہ انتخاب کے ساتھ ہوگا تاہم میری ہنوز دیانتدارانہ اور مخلصانہ رائے یہی ہے کہ اسلام کو، پارٹی پروگرام بنا کر، مخلوط انتخابات کو ذریعہ نمائندگی بنایا جائے، بشرطیکہ خالص اسلامی لیجسلیچر، کا قیام فی الوقت ممکن نہ ہو۔ اس طرح اسلامی مقاصد بہتر طریقہ پر اور آسانی سے حاصل کیے جا سکیں گے، اور جداگانہ انتخاب کے مقابلہ میں کم رکاوٹیں پیش آئیں گی۔

آپ نے اپنے مکتوب کے دوسرے پیراگراف کے آخری حصہ میں تحریر فرمایا ہے کہ "ہمیں اپنے آخری مقصود کے راستے میں کچھ درمیانی مقاصد اور قریب الحصول مقاصد بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے ایک ایک کو حاصل کرتے ہوئے ہم آگے بڑھتے جائیں"۔ دراصل یہ ایک سخت

مغالطہ ہے، جو بہت سی تحریکات کو، بالخصوص مسلمانوں کی بیشتر جماعتوں کو پیش آتا رہا اور وہ کسی قریب الحصول مقصد میں ایسے ڈوبے کہ،

دریں ورطہ کشتی فروشد ہزار کہ پیدا نہ شد تختہ بر کنار

کی مصداق بن کر رہ گئے۔ حالانکہ ان درمیانی چیزوں کو زیادہ سے زیادہ کوئی حیثیت حاصل ہے تو محض ایک ذریعہ ہونے کی ہے۔ اگرچہ آپ کا یہ اہتمام قابل ستائش ہے کہ "آخری مقصود نگاہوں سے اوجھل نہ رہے"، لیکن میرے نزدیک درمیانی چیزوں کو قریب الحصول مقصد کا درجہ دینا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ ان کی حیثیت محض ذریعہ کی رہنی چاہیے، مقصد کی حیثیت سے ان پر ہرگز زور نہ دینا چاہیے۔

آئیڈیلزم اور حکمت عملی کے درمیان توازن برقرار رکھنے کا صحیح طریقہ جماعت کے مقصد اور طریق کار میں یکسانیت و ہمواریت کا برقرار رہنا ہے، نیز مقصد اور طریق کار کے درمیان ایسا ربط قائم رکھنا ہے جو ہر مرحلہ پر راستہ کے ہر موڑ کو منزل کی طرف پھیر دینے والا ہو، موجودہ دور کے ذہنی انتشار اور پراگندگی افکار پر غالب آنے کے لیے سب سے بڑی دانائی اور حکمت عملی یہی ہے کہ، مقصد کی ہمہ گیری کو کمزور نہ ہونے دیا جائے۔

لادینی دستور کی موجودگی میں، ہماری جنگ ایک کھلے دشمن کے ساتھ تھی۔ فرعون اور ابولہب کی ذہنیتوں سے مقابلہ درپیش تھا۔ آہن و سیف اور خار و آتش سے گذرنے والا وہ راستہ اگرچہ خوفناک ضرور تھا مگر فریب ناک نہیں تھا۔ لیکن ایک نیم دینی دستور کی موجودگی میں ہمارا سابقہ منافقانہ ذہنیتوں سے پڑ جاتا ہے جس طرح حضرت علی علیہ السلام اور حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو پیش آیا تھا، پھر نیم ملا خطرۂ ایمان کی مشہور کہاوت سے بھی آپ بے خبر نہیں ہوں گے۔ میرے نزدیک جہاں ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بننے سے روک دینا ایک بڑی کامیابی ہے، وہاں ریاست کا نیم دینی ریاست بن کر رہ جانا بھی ایک بہت بڑے خطرے کا آغاز ہو سکتا ہے، جس سے نہ صرف پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ہی بلکہ اسلام کے لیے بھی بہت سے داخلی فتنے

پیدا ہو سکتے ہیں، اس لیے اس صورت حال کا جلد سے جلد تدارک کیا جانا نہایت ضروری ہے' ورنہ دستور کا نام اسلامی دستور ہونا، برعکس نہند نام زنگی را کافور کا مصداق ہو جائے گا اور دستور کا یہ اعلان کہ کوئی قانون، کتاب وسنت کے خلاف نہ بنایا جائے گا۔ ۱۸۵۷ء کے ملکہ وکٹوریہ کے مشہور اعلان کی طرح کا محض کاغذی محضر بن کر رہ جائے گا، جس میں کہا گیا تھا کہ "مذہبی معاملات میں، حکومت کی طرف سے کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی"۔

فی الحقیقت، جب تک خدا کی حاکمیت کو واضح طور پر نہ تسلیم کر لیا جائے، کتاب وسنت کو مثبت طور پر قانون سازی کا ماخذ اور دستور پر بالادست نہ مان لیا جائے، کتاب وسنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ واہل بصیرت ارکان پر مشتمل لیجسلیچر کا قیام عمل میں نہ آجائے اور کتاب وسنت کی تعبیر و توضیح کا حق، اصول سلف کے مطابق، ماہرین علوم اسلامیہ و حاملین شریعت کے لیے خاص نہ کر دیا جائے، اس وقت تک ذرا سی غفلت سے، موجودہ دستور کو غیر اسلامی مقاصد کے لیے بڑی آسانی اور آزادی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے اور پھر ان مردود مقاصد کو، اسلامی مقاصد کی حیثیت سے عام کیا جا سکتا ہے۔

آخر میں جماعت کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ میرے قریبی حلقوں میں، جماعت کے کارکن حضرات، جن کے اخلاص، دیانت اور سرگرمی کا میں دل سے قدرداں ہوں، اور جن کے احترام سے میرا قلب ہر وقت معمور رہتا ہے، وہ اپنے عام اجتماعات میں نہ تو دستور کے ان ناقص پہلوؤں پر عوام کو توجہ دلاتے ہیں اور نہ مسئلہ انتخابات کے سلسلہ میں خالص اسلامی مجلس شوریٰ کا نظریہ عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عوام اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ ہمارے ملک کا دستور کامل اسلامی دستور بن چکا ہے، صرف جداگانہ انتخاب کی ایک آخری اسلامی مہم باقی ہے۔ پھر عوام سے ربط بڑھانے کا طریقہ بھی تنقیدی اور منفی ڈھنگ کا ہوتا ہے جس سے خواہ مخواہ، مقامی، شخصی، اور جزوی اختلافات کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ جماعتی عصبیت میں اتنے کلیت پسند بن جاتے ہیں کہ بعض سیاسی و مذہبی امور پر، جزوی و فروعی اختلاف کو بھی جماعت سے ذاتی یا گروہی عناد کا درجہ دے بیٹھتے ہیں۔

اور اس ملک کی گذشتہ سیاسی و مذہبی تاریخ سے شاید پوری طرح واقف نہ ہونے کی بنا پر باجماعتی غلو کے غیر شعوری جذبہ کی بنا پر، موجودہ معاملات کو، گذشتہ معاملات سے اس طرح گڈمڈ کر دیتے ہیں کہ پیش روؤں کے کاموں کی اکثر غلط ترجمانی ہوتی ہے، اور اسلاف کی بصیرت اسلامی اور خلوص مشکوک نظر آنے لگتا ہے۔ اگرچہ اس بارے میں جماعت کے بعض اہل قلم اور آپ سے بھی کم و بیش شکایت ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارے قریبی کارکن اور معزز ارکان جماعت تو اس بارے میں بجائے خود بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔ اور اس وقت اور اس ماحول کے معیار پر، گذشتہ معاملات کو قیاس کرنے کے عادی سے بن گئے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وسیع النظری اور وسیع القلبی سے کام لیا جائے اور مقصد سے نیچے نہ آیا جائے۔ باایں ہمہ موجودہ سوسائٹی میں، مجھے یہ سب سے زیادہ عزیز اور قابل احترام ہیں۔ اللہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور اپنے دین کی صحیح صحیح خدمت لینے کے قابل بنائے۔

جواب

افسوس ہے کہ آپ نے میرے پچھلے خط کے اس فقرے پر غور نہیں کیا کہ ہم اپنی تحریک خلا میں نہیں چلا رہے ہیں بلکہ واقعات کی دنیا میں چلا رہے ہیں۔ اور ہمیں محض اعلان و اظہارِ حق ہی نہیں کرنا ہے بلکہ اقامتِ حق کے لیے بھی کوشش کرنی ہے جس کے لیے ہم کو اسی واقعات کی دنیا میں سے راستہ نکالنا ہوگا۔ یہ بات میں نے اپنے جواب کی ابتداء ہی میں اس لیے لکھ دی تھی کہ مجھے آپ کے خط کو پڑھ کر یہ محسوس ہو گیا تھا کہ آپ اپنے خیالات کی دنیا میں اس قدر گم ہیں کہ واقعات کی اس دنیا پر آپ کی نگاہ نہیں جاتی جس میں ہم اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ میرے اس اندیشے کی تصدیق آپ کے دوسرے خط سے ہو گئی اور معلوم ہوا کہ میرے توجہ دلانے پر بھی آپ اس پہلو کی طرف دیکھنے پر مائل نہیں ہو سکے ہیں۔

دوسری بات میں نے ابتداء ہی میں یہ عرض کی تھی کہ جسے واقعات کی دنیا میں صرف اعلان حق ہی نہیں بلکہ اقامتِ حق کا کام بھی کرنا ہو اس کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ نظریت اور حکمت عملی کے درمیان زیادہ سے زیادہ توازن برقرار رکھے۔ اس بات کو بھی آپ نے پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں فرمائی۔ میں محسوس کرتا ہوں، کہ

جب تک یہ دوسری بات بھی اچھی طرح آپ کے ذہن نشین نہ ہو جائے آپ کے لیے ہماری تحریک کے طریق کار کو سمجھنا مشکل ہو گا۔ اس لیے آپ کے ارشادات پر کلام کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ میں ان دونوں باتوں کو پھر کھول کر بیان کر دوں۔

ہم جس ملک اور جس آبادی میں بھی ایک قائم شدہ نظام کو تبدیل کر کے دوسرا نظام قائم کرنے کی کوشش کریں گے وہاں ایسا علاقہ ہم کو کبھی نہ ملے گا کہ ہم بس اطمینان سے "براہ راست" اپنے مقصود کی طرف بڑھتے چلے جائیں۔ لامحالہ اس ملک کی کوئی تاریخ ہو گی، اس آبادی کی مجموعی طور پر اور اس کے مختلف عناصر کی انفرادی طور پر کچھ روایات ہوں گی۔ کوئی ذہنی اور اخلاقی اور نفسیاتی فضا بھی وہاں موجود ہو گی۔ ہماری طرح کچھ دوسرے دماغ اور دست و پا بھی وہاں پائے جاتے ہوں گے جو کسی اور طرح سوچنے والے اور کسی اور راستے کی طرف اس ملک اور اس آبادی کو لے چلنے کی سعی کرنے والے ہوں گے۔ ان مختلف عوامل میں سے کچھ ہمارے موافق ہوں گے تو کچھ ناموافق اور مزاحم بھی ہوں گے۔ اور قائم شدہ نظام کا کسی کم یا زیادہ مدت سے وہاں قائم ہونا خود اس بات کی دلیل ہو گا کہ یہ عوامل ہماری موافقت میں کم اور اس کی موافقت میں زیادہ ہیں۔ علاوہ بریں یہ بات بالکل فطری اور عین متوقع ہے کہ ہمارے مقابلہ میں یہ نظام ضرور ان تمام عوامل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا جو اس کے لیے سازگار ہیں یا بن سکتے ہیں، اور ایسے تمام عوامل کو ہمارے لیے ناموافق یا کم از کم غیر مفید بنانے کی بھی سعی کرے گا جنہیں وہ سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے حق میں سازگار ہیں، اور وہ تمام دوسری تحریکیں بھی جو ہمارے مقصد کی مخالف ہیں یا تو قائم شدہ نظام کی حمایت کریں گی، یا پھر موجود الوقت عوامل کو حتی الامکان ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گی۔

ان حالات میں نہ تو اس امر کا کوئی امکان ہے کہ ہم کہیں اور سے پوری تیاری کر کے آئیں اور یکایک اس نظام کو بدل ڈالیں جو ملک کے ماضی اور حال میں اپنی گہری جڑیں رکھتا ہے، نہ یہ ممکن ہے کہ اسی ماحول میں رہ کر کشمکش کیے بغیر کہیں الگ بیٹھے ہوئے اتنی تیاری کر لیں کہ میدانِ مقابلہ میں اترتے ہی سیدھے منزل مقصود پر پہنچ جائیں، اور نہ اس بات ہی کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہم اس کشمکش ہی سے گزرتے ہوئے کسی طرح "براہِ راست" اپنے مقصود تک جا پہنچیں۔ ہمیں لامحالہ واقعات کی اس دنیا میں موافق عوامل سے مدد لیتے ہوئے اور مزاحم

طاقتوں سے کشمکش کرتے ہوئے بتدریج اپنا راستہ نکالنا ہوگا۔ ہر قدم جس کے لیے گنجائش نکل آئے فوراً اور بروقت اٹھا دینا ہوگا۔ دوسرے قدم کی گنجائش پیدا کرنے کے لیے پورا زور لگانا پڑے گا، اور سمت مخالف کی دھکا پیل اگر ہمیں پیچھے دھکیلے تو اس بات کی کوشش کرنی ہوگی کہ پہلے قدم کی جگہ پاؤں تلے سے نہ نکل جائے۔ اس کشمکش کے دوران میں جتنی ضروری بات یہ ہے کہ ہمارا آخری اور اصل مقصود ہماری نگاہوں سے اوجھل نہ ہو، اتنی ہی ضروری یہ بات بھی ہے کہ ہم اس کی سمت میں بڑھنے کے لیے ہر درمیانی قدم کو مقصدی اہمیت دیں، جو قدم رکھا جا چکا ہے اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط بنائیں، آگے کے قدم کے لیے زیادہ سے زیادہ قوت فراہم کریں، اور جونہی کہ اس کے لیے جگہ پیدا ہو اس پر فوراً قبضہ کرلیں۔ آخری مقصود پر نگاہ جمانا اگر اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا کوئی قدم غلط سمت میں نہ اٹھے، تو درمیان کے ہر قدم کو اس کے وقت پر فوری مطمح نظر (IMMEDIATE OBJECTIVE) کی حیثیت دینا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر پیش قدمی کا امکان ہی نہیں رہتا جسے صرف تمنائیں بیان کرنے پر اکتفا کرنا نہ ہو بلکہ منزل مقصود کی طرف واقعی چلنا بھی ہو اسے تو ہر قدم جمانے اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے تمام ممکن الحصول موافق طاقتوں سے اس طرح کام لینا اور تمام موجود مزاحمتوں کو ہٹانے کے لیے اس طرح لڑنا ہوگا کہ گویا اس وقت کرنے کا کام یہی ہے۔

اس معاملہ میں صرف نظریت کام نہیں دیتی بلکہ اس کے ساتھ عملی حکمت ناگزیر ہے۔ اس حکمت کو نظر انداز کر دینے والا نظری آدمی طرح طرح کی باتیں کر سکتا ہے کیونکہ وہ یا تو قافلے میں شامل ہی نہیں ہوتا، یا پھر قافلے کو لے کر چلنے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی۔ مگر جسے چلنا ہی نہ ہو بلکہ چلانا بھی ہو وہ ہر بات کو محض اس کے خیالی حسن کی بنیاد پر قبول نہیں کر سکتا۔ اسے تو عملی نقطۂ نظر سے تول کر دیکھنا ہوتا ہے کہ جن حالات میں وہ کام کر رہا ہے، جو قوت اس وقت اس کے پاس موجود ہے یا فراہم ہونی ممکن ہے، اور جو جو مزاحمتیں راستے میں موجود ہیں، ان سب کو دیکھتے ہوئے کونسی بات قابل قبول ہے اور کونسی نہیں، اور یہ کہ کس بات کو قبول کرنے کے نتائج کیا ہوں گے۔ نظری آدمی تو بے تکلف کسی مرحلے پر بھی کہہ سکتا ہے کہ ایک ایک قدم اٹھانے اور قدم قدم کی جگہ کے لیے کشمکش کرنے کی کیا ضرورت ہے، "براہ راست" کیوں نہیں بڑھ جاتے۔ مگر کام کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ راستے کی مزاحم طاقتوں کے ہجوم میں سے آخر براہ راست کیسے بڑھے

جاؤں؟ اُن کے سر پر سے چھلانگ لگا کر جاؤں؟ زمین کے نیچے سے سرنگ لگا کر جا پہنچوں؟ یا کوئی تعویذ ایسا لاؤں کہ اسے دیکھتے ہی یہ سارا ہجوم چھٹ جائے اور میں اپنے قافلے کو لیے ہوئے سیدھا اپنی منزل کی طرف بڑھتا چلا جاؤں؟ نظری آدمی اس کشمکش کے دوران میں کسی جگہ بھی ٹھیر جانے یا پیچھے ہٹ جانے کا بڑے اطمینان سے مشورہ دے سکتا ہے۔ وہ کہہ سکتا ہے کہ ٹھیر کر یا پیچھے ہٹ کر تیاری کرو اور پھر اس شان سے آؤ کہ بس ایک ہی ہلّے میں سابق نظام ختم اور نیا نظام پورا کا پورا قائم ہو جائے۔ مگر کام کرنے والے کو ایسے مشورے قبول کرنے سے پہلے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ مزاحم طاقتوں کی موجودگی میں کشمکش روک کر ٹھیر جانا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ پیچھے ہٹوں تو یک دم منزل پر پہنچنا تو درکنار، اُس جگہ واپس آنے کا بھی کوئی امکان باقی رہ جاتا ہے جہاں سے پلٹنے کے لیے کہا جا رہا ہے؟ اور کیا میرے ٹھیرنے یا ہٹنے کی صورت میں مزاحم طاقتیں بھی ٹھیر یا ہٹ جائیں گی کہ وہ ماحول کو میرے لیے اور زیادہ ناسازگار بنانے سے رک جائیں، اور میں اسے خوب سازگار بنا کر اور خود پوری طرح تیار ہو کر بڑے اطمینان سے ایک بھرپور حملہ کر سکوں؟ غرض نظری آدمی کے لیے ہر قابلِ تصور تجویز لے آنا ممکن ہے، کیونکہ جن تخیلات کے عالم میں وہ رہتا ہے وہاں حالات اور واقعات موجود نہیں ہوتے، صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں۔ مگر کام کرنے والا واقعات کی دنیا میں کام کرتا ہے اور اُس پر کام چلانے کی ذمہ داری ہوتی ہے اس لیے وہ عملی مسائل کو کسی حال میں نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ایک اور حیثیت سے بھی نظریت اور حکمت عملی میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھنا اُس شخص کے لیے ضروری ہے جو واقعات کی دنیا میں عملاً اپنے نصب العین تک پہنچنا چاہتا ہو۔ آئیڈیلزم کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے نصب العین کی انتہائی منزلِ سے کم کسی چیز کو آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے، اور جن اصولوں کو وہ پیش کرتا ہے ان پر سختی کے ساتھ جما رہے۔ مگر واقعات کی دنیا میں یہ بات جوں کی توں کبھی نہیں چل سکتی۔ یہاں نصب العین تک پہنچنے کا انحصار ایک طرف اُن ذرائع پر ہے جو کام کرنے والے کو بہم پہنچیں۔ دوسری طرف اُن موافق یا ناموافق ... ہے جو اسے کام کرنے کے لیے حاصل ہوں، اور تیسری طرف موافق اور ناموافق حالات کے اُن گھٹنے بڑھنے والے اسباب پر ہے جو راستے کے مختلف مراحل میں اسے سابقہ پیش آئے۔ یہ تینوں چیزیں مشکل ہی سے کسی کو بالکل ہموار مل سکتی ہیں۔ کم از کم اہل حق کو تو یہ کبھی سازگار نہیں ملی ہیں اور نہ آج ملنے کے

کوئی آثار نہیں۔ اس صورتِ حال میں جو شخص یہ چاہتا ہے کہ پہلا قدم آخری منزل ہی پر رکھوں گا، اور پھر دوران سعی میں کسی مصلحت و ضرورت کی خاطر اپنے اصولوں میں کسی استثناء اور کسی لچک کی گنجائش بھی نہ رکھوں گا، عملاً اس مقصد کے لیے کوئی کام نہیں کر سکتا۔ یہاں آئیڈیلزم کے ساتھ برابر کے تناسب سے حکمتِ عملی کا ملنا ضروری ہے۔ وہی یہ طے کرتی ہے کہ منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے راستے کی کن چیزوں کو آگے کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانا چاہیے، کن کن مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کن کن موانع کے ہٹانے کو مقصدی اہمیت دینی چاہیے، اور اپنے اصولوں میں سے کن میں بے لچک ہونا اور کن میں اہم تر مصالح کی خاطر حسبِ ضرورت لچک کی گنجائش نکالنا چاہیے۔

اس معاملہ میں توازن کا بہترین نمونہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل میں ملتا ہے۔ آپ کی زندگی میں اس کی جو بے شمار مثالیں ملتی ہیں ان میں سے میں یہاں صرف ایک مثال پیش کروں گا۔ آپ جو نظامِ زندگی قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئے تھے وہ پوری نوعِ انسانی کے لیے تھا، صرف عرب کے لیے نہ تھا، مگر عرب میں اس کا قائم ہونا اور پوری طرح جم جانا، دنیا میں اس کے قیام کا ایک ناگزیر ذریعہ تھا، کیونکہ آپ کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے جو مواقع عرب میں حاصل تھے وہ اور کہیں نہ تھے۔ اس لیے آپ نے اس کو مقصدی اہمیت دی، بیرونی دنیا میں دعوت پہنچانے کی صرف ابتدائی تدبیروں پر اکتفا فرمایا، اپنی پوری توجہ اور پوری طاقت صرف عرب میں اقامتِ دین پر صرف فرمائی، اور بین الاقوامیت کی خاطر کوئی ایسا کام نہ کیا جو عرب میں اس مقصدِ عظیم کی کامیابی کے لیے نقصان دہ ہو۔ اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرقِ مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضور نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا، بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو عالی ترین مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش، "امام قریش میں سے ہوں"۔ ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص معاملہ میں یہ ہدایت، مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر

پیش کیا گیا تھا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے ایسے اہم اصول میں اتنے بڑے استثنار کی گنجائش کیوں پیدا کی گئی، اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ اُس وقت عرب کے حالات میں کسی غیر عرب تو درکنار، کسی غیر قریشی خلیفہ کی خلافت بھی عملاً کامیاب نہیں ہو سکتی تھی، اس لیے حضور نے خلافت کے معاملہ میں مساوات کے اس عام اصول پر عمل کرنے سے صحابہ کو روک دیا۔ کیونکہ اگر عرب ہی میں حضور کے بعد اسلامی نظام درہم برہم ہوجاتا تو دنیا میں اقامتِ دین کا فریضہ کون انجام دیتا۔[1] یہ اس بات کی صریح مثال ہے کہ ایک اصول کو قائم کرنے پر ایسا اصرار جس سے اس اصول کی بہ نسبت بہت زیادہ اہم دینی مقاصد کو نقصان پہنچ جائے، حکمتِ عملی ہی نہیں حکمتِ دین کے بھی خلاف ہے۔ مگر یہ معاملہ اسلام کے سارے اصولوں کے بارے میں یکساں نہیں ہے۔ جن اصولوں پر دین کی اساس قائم ہے، مثلاً توحید اور رسالت وغیرہ، اُن میں عملی مصالح کے لحاظ سے لچک پیدا کرنے کی کوئی مثال حضور کی سیرت میں نہیں ملتی، نہ اس کا تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔

ان امور کو آپ ذہن نشین کرلیں تو خود ہی اپنی بہت سی باتوں کا جواب پا سکتے ہیں۔ تاہم میں کوشش کروں گا کہ آپ کی باتوں پر سلسلہ وار مختصر گفتگو کر کے بھی اپنا موقف واضح کروں۔

۱۔ آپ کا خیال ہے کہ موجودہ نیم اسلامی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرنے کے لیے پہلا اور زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ اور اہل بصیرت مسلمانوں پر مشتمل لیجسلیچر کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس غرض کے لیے آپ براہ راست جدوجہد کو ترجیح دیتے ہیں اور اس براہ راست جدوجہد کی ضرورت آپ کے نزدیک اس بنا پر اور بھی زیادہ ہے کہ ملک میں مختلف و متضاد طبقے دستور کے نام پر اسلام کی عجیب و غریب اور جدید تعبیریں کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ تاہم آپ بدرجۂ آخر یہ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں کہ اس مقصد کے لیے انتخابات کو ذریعہ بنایا جائے۔

اس ارشاد میں جتنی باتیں آپ نے فرمائی ہیں ان میں سے کسی کے بھی عملی پہلو پر آپ نے غور نہیں فرمایا۔ واقعات کی دنیا میں ہم جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں مجالس قانون ساز کے قیام کی ابتداء انگریزوں کے دور حکومت میں ہوئی۔ اس نظام کو انھوں نے اپنے نظریات کے مطابق

---

[1] اس پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۷۶ - ۸۴

قومی جمہوری، لادینی ریاست کے اصولوں پر قائم کیا۔ انہی اصولوں پر سالہا سال تک اس کا مسلسل ارتقاء ہوتا رہا اور انہی اصولوں پر نہ صرف پوری ریاست کا نظام تعمیر ہوا، بلکہ نظامِ تعلیم نے اُن کے مطابق ذہن تیار کیے۔ ہمارے معاشرے کے مختلف بااثر طبقات نے ان کو پوری طرح اپنا لیا، اور بحیثیت مجموعی سارے معاشرے نے ان کے ساتھ مطابقت پیدا کرلی۔ ان واقعات کی موجودگی میں جتنے کچھ ذرائع ہمارے (یعنی دینی نظام کے حامیوں کے) پاس تھے ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا کہ کم از کم آئینی حیثیت سے اس عمارت کی اصل کا فرانہ بنیاد (لادینیت) کو بدلوا کر اس کی جگہ وہ بنیاد رکھ دی گئی جس کی بنا پر آپ موجودہ دستور کو نیم دینی تسلیم کر رہے ہیں۔ پچھلے نو سال میں یہ کام جن مشکلوں سے ہوا ہے ان کو آپ بھول نہ جائیں، اور اب بھی لادینی رجحانات رکھنے والے بااثر طبقے اس کو ڈھا دینے کے لیے جس طرح زور لگا رہے ہیں اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کرلیں کیا ان حالات میں یہ بات عملاً ممکن تھی کہ ٹھیٹھ اسلامی تصور کے مطابق ایک لیجسلیچر قائم ہو سکتی؟ اور کیا ہماری طرف سے یہ عقلمندی ہوتی کہ جو کم سے کم قابلِ قبول چیز اس وقت حاصل ہو رہی ہے اُسے لے کر آئندہ کی پیش قدمی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ہم پوری مطلوب چیز پر اصرار کرتے اور نہ ملتی تو جو کچھ مل رہا تھا اسے بھی رد کر دیتے؟

اب اس نیم اسلامی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرانے کا مسئلہ ہمارے سامنے درپیش ہے تاکہ آپ کے بقول "دستور کے اسلامی تقاضوں کو بغیر کسی تحریف کے صحیح طور پر پورا کیا جا سکے۔" آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ اس کے لیے ایسی لیجسلیچر کی ضرورت ہے جو کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہلِ تقویٰ و اہلِ بصیرت مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ مگر اس کے لیے آپ انتخابات کے بجائے براہِ راست جدوجہد کو ترجیح دیتے ہیں۔ ذرا اس کا عملی پہلو بھی دیکھیے۔ اس طرح کی لیجسلیچر کے لیے موزوں آدمی نامزد کرنے کا کام تو ظاہر ہے کہ کسی کو نہیں سونپا جا سکتا۔ یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ان افراد کے انتخاب کا حق صرف مدارسِ دینیہ اور مذہبی جماعتوں اور دیندار لوگوں تک محدود رکھا جائے۔ اور اگر ایسا کیا بھی جائے تو ان کے ووٹوں سے بحالت موجودہ جیسے لوگ منتخب ہو کر آئیں گے ان کے ہاتھوں شاید ہمیشہ کے لیے اسلامی ریاست کے تصور ہی کی مٹی پلید ہو جائے۔ حالات کو دیکھتے ہوئے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ عوام کے حق رائے دہندگی کے سوا انتخاب کی

اور کوئی صورت نہ تو ممکن ہے اور نہ مقابلۃً زیادہ مناسب۔ اس بات کو آپ سمجھ لیں تو یہ بات بھی آپ کی سمجھ میں خود بخود آجائے گی کہ اب اس نیم دینی دستور کے کامل اسلامی دستور میں تبدیل ہونے اور اُس کے اسلامی تقاضوں کو بلا تحریف پورا کرنے کا سارا انحصار اس پر ہے کہ ملک کی عام آبادی کو ذہنی اور اخلاقی حیثیت سے اس قابل بنانے کی کوشش کی جائے کہ وہ کتاب وسنت کا علم رکھنے والے اہلِ تقویٰ، واہلِ بصیرت لوگوں کے طالب بھی ہوں اور ان کو تلاش بھی کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تدریج ایک طویل ہمہ گیر اور جاں گسل محنت سے ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کام خلا میں نہ ہوگا بلکہ ایسی حالت میں ہوگا کہ مزاحم طاقتیں بہت بڑے پیمانے پر زبردست ذرائع اور قوتوں کے ساتھ اِسی آبادی کے ذہن اور اخلاق کو بالکل برعکس نوعیت کے انتخاب کے لیے تیار کرتی رہیں گی اور ساتھ ساتھ اپنی اس تیاری کی فصل ہر انتخاب میں کاٹتی بھی رہیں گی جس سے ان کی قوتِ مزاحمت یا تو بڑھے گی یا کم از کم برقرار رہے گی۔ اس حالت میں انتخابات کو نظر انداز کر کے صرف براہِ راست جدوجہد پر اکتفا کرنے کا آخر کیا حاصل آپ کی سمجھ میں آتا ہے؟ "براہِ راست جدوجہد" کو خواہ اس معنی میں لیا جائے کہ آپ خارجی دباؤ ڈال کر مطلوبہ نوعیت کی لیجسلیچر کو از روئے دستور لازم کرانا چاہتے ہیں، یا اس معنی میں کہ آپ ملک میں وہ عام ذہنی واخلاقی انقلاب لانا چاہتے ہیں جس سے کتاب وسنت کا علم رکھنے والے اہلِ تقویٰ واہلِ بصیرت لوگ لیجسلیچر پر غالب یا پوری طرح قابض ہو جائیں، دونوں صورتوں میں یہ نتیجہ عملاً جب بھی رونما ہوگا محض باہر سے براہ راست نہ ہوگا، بلکہ انتخابی نظام کے توسط ہی سے ہوگا، خواہ اس واسطہ کو آپ آج استعمال کریں یا دس بیس یا پچاس سال کے بعد۔ پھر جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو یہ براہ راست جدوجہد انتخابات کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کے ساتھ ساتھ کیوں نہ ہو؟ کیوں نہ ایسا ہو کہ عام ذہنی واخلاقی انقلاب کے لیے براہ راست جدوجہد بھی پوری طاقت کے ساتھ کی جائے، اور اس میں جتنی جتنی کامیابی نصیب ہو اُسے انتخابات پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہونے کے لیے استعمال بھی کیا جاتا رہے۔ اس محاذ کو مزاحم طاقتوں کے لیے بالکل کھلا چھوڑ دینے میں آپ کیا فائدہ دیکھتے ہیں؟ اور کیا آپ کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جتنی مدت بھی آپ اسے ان کے لیے خالی چھوڑنے کے بعد اس کی طرف رجوع کریں گے (اور رجوع بہرحال آپ کو

اپنے مقصد کے لیے کبھی نہ کبھی کرنا پڑے گا) قدم رکھنے کی جگہ کو تنگ سے تنگ تر ہی پائیں گے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے حق میں جو بحث آپ نے کی ہے اس سے پھر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ واقعی صورتِ حال کو نظر انداز کر کے ایک ایسا خلا فرض کر رہے ہیں جس میں آپ کی خیالی تجویزیں آپ کے حسب منشا نافذ ہو سکتی ہیں۔ آپ سمجھتے ہیں کہ یہاں مجرّد ایک انسانی آبادی رہتی ہے جس کا نہ کوئی ماضی ہے نہ حال، اس سادہ و بے رنگ مجموعے کے سامنے بس ایک اسلامی پروگرام رکھ دینا ہے۔ حالانکہ یہاں ایک ایسی آبادی رہتی ہے جس پر ایک طویل مدت سے جمہوریت، لادینیت اور وطنی قومیت کے تصورات پر مبنی ایک نظام عملاً مسلط رہا ہے۔ اس نظام کی جڑیں نہ صرف نظام حکومت میں، بلکہ نظام تعلیم اور نظام تمدن میں بھی دور دور تک پھیلی ہوئی اور گہری جمی ہوئی ہیں اور اس نظام کے تینوں بنیادی تصورات ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم کی طرح جُڑے رہے ہیں۔ اس کے ساتھ دوسرا امر واقعی جس سے ہم دوچار ہیں یہ ہے کہ اس آبادی میں صرف انسان نہیں بستے ہیں بلکہ مسلمان اور غیر مسلم، دو بڑے عنصر بستے ہیں اور غیر مسلم عنصر کا بڑا حصہ ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ مسلمانوں میں سے جس طبقے یا جن طبقات کے ہاتھ میں عملاً اس وقت زمام کار ہے وہ ذہنی طور پر اُس دینی نظام کا مخالف ہے جس کی طرف ہم ملک کو کھینچ رہے ہیں اور اس لادینیت کا حامی ہے جو ایک مدتِ دراز سے مسلط چلی آرہی تھی۔ غیر مسلموں میں جس ہندو عنصر کی غالب اکثریت ہے اس کو وطنی قومیت کے تصور سے نہ صرف جذباتی وابستگی ہے بلکہ اس کی ساری تمنائیں اور اس کے سارے مفاد اس امر سے وابستہ ہیں کہ یہاں اسی تصورِ قومیت پر لادینی جمہوری نظام قائم ہو۔ ان حالات میں مخلوط انتخاب اُس سادہ شکل میں نہ آئے گا جس میں آپ اُسے اسلامی پروگرام پیش کرنے کے لیے موزوں سمجھتے ہیں، بلکہ اپنے اس پورے تاریخی اور موجود پس منظر کے ساتھ آئے گا، اور اُن تمام عناصر کو آلۂ کار بن کر آئے گا جو وطنی قومیت اور لادینیت کے حامی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ مشرقی پاکستان کے حالات پر جس کی نگاہ ہو وہ کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ وہاں مخلوط انتخاب لادینی اور بنگلہ قوم پرستی کی بہ نسبت اسلامی پروگرام کے لیے زیادہ سازگار ہو سکے گا۔ دونوں کی پشت پر جو قوتیں اور جو موافق اسباب و وسائل وہاں موجود ہیں ان کا موازنہ کرنے سے یہ خوش فہمی بآسانی دُور ہو سکتی ہے۔ جداگانہ انتخاب کے

جتنے نقصانات اور مخلوط انتخاب کے جتنے فوائد بھی آپ گنائیں اُن کو جوں کا توں مان لینے کے بعد بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ جس واقعی صورت حال سے ہم کو اس وقت سابقہ درپیش ہے اُس کو نظر انداز کرکے ان کے درمیان موازنہ کرنا اور ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرلینا حکمت عملی کے لحاظ سے کہاں تک درست ہے؟ اس بحث میں آپ اس بات کو بھی بھول گئے ہیں کہ اسلامی پروگرام پیش کرنے کا ہر جگہ ایک ہی لگا بندھا طریقہ نہیں ہے بلکہ حال اور مقام کے لحاظ سے اس کے مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ وہ ہوتی ہے جہاں سب غیر مومن ہوتے ہیں۔ دوسری جگہ وہ ہوتی ہے جہاں اگرچہ مومن موجود ہوتے ہیں مگر غلبہ کفار کا ہوتا ہے اور کفر ہی کا نظام مسلط ہوتا ہے۔ تیسری جگہ وہ ہوتی ہے جہاں اسلام کا اقرار کرنے والوں کا غلبہ ہوتا ہے مگر وہ غافل یا گمراہ ہو کر سراسر کافرانہ نظام پر چل رہے ہوتے ہیں۔ ایک اور جگہ ایسی ہوتی ہے جہاں تسلط تو کافرانہ نظام ہی کا ہوتا ہے مگر اقرار اسلام کرنے والوں کی اکثریت اسلامی نظام کی خواہشمند ہوتی ہے۔ اور ان سب سے مختلف پوزیشن اس جگہ کی ہوتی ہے جہاں اسلام کا اقرار کرنے والے نہ صرف غالب ہوتے ہیں بلکہ اسلامی نظام کی نیو بھی رکھی جاچکی ہوتی ہے اور پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ اب اس ادھورے کام کی تکمیل کرنی ہے۔ پاکستان میں ہم پہلی چار حالتوں سے نہیں بلکہ اس آخری حالت سے دوچار ہیں۔ یہاں آپ کو سب سے پہلے اُن لوگوں کو پکارنا ہے جو اسلام کا اقرار کرتے ہیں، اس غرض کے لیے پکارنا ہے کہ وہ اس ادھوری تعمیر کی تکمیل کے لیے تیار ہوں، اور وہ پروگرام پیش کرنا ہے جو اس مرحلے کے لیے درکار ہے۔ اس موقع پر اگر طریق انتخاب مخلوط ہوگا تو آپ کو بہت پیچھے ہٹ کر اُس جگہ سے دعوت کا آغاز کرنا ہوگا جو مسلم اور غیر مسلم سب کو یکساں اپیل کرسکے اور رکھی ہوئی نیو کو نظر انداز کرکے بجائے خود نیو رکھنے کی بات شروع کرنی پڑے گی جس پر ہر وہ شخص آپ کی عقلمندی پر ہنس دے گا جو واقعی صورت حال کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور اگر آپ ایسا نہ کریں گے بلکہ پروگرام اس ادھورے کام کی تکمیل ہی کے لیے پیش کریں گے تو مجھے بتائیے کس عقل کی رو سے آپ غیر مسلم آبادی کے پاس یہ دعوت لے کر جائیں گے کہ نیم دینی دستور کو کامل اسلامی دستور میں تبدیل کرنے اور دستور اسلامی کے تقاضوں کو بلا تحریف پورا کرنے کے لیے کتاب و سنت کا علم رکھنے والے اہل تقویٰ و اہل بصیرت درکار ہیں، آؤ ہمارے ساتھ تم بھی مل کر

ان کا انتخاب کرو اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس رکھی ہوئی بنو کو ڈھا کر وطنی قومیت کے تصور پر لادینی نظام تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

پھر یہاں سوال صرف عقل و حکمت ہی کا نہیں، اسلام کے اس آئین کا بھی ہے جو قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ یہ آئین اسلام کے ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کو بہرحال ایک حیثیت میں نہیں رکھتا۔ ماننے والے خواہ ایمان اور عمل کے لحاظ سے کتنے ہی مختلف مراتب میں ہوں، خواہ ان میں سے کوئی صدیقیت کا مرتبہ رکھتا ہو اور کوئی اسلام کی بالکل ابتدائی سرحد پر کھڑا ہو، بہرحال آئینی پوزیشن میں وہ سب برابر کے شریک ہیں اور نہ ماننے والوں کی آئینی پوزیشن ان سے مختلف ہے۔ اسلامی نظام جب بھی قائم ہوگا، اسلام کے آئین کی رو سے اس کی عمارت مسلم معاشرے کی بنیاد ہی پر اٹھائی جائے گی۔ اس کے مدار کار وہی لوگ ہوں گے جو اس کے حق ہونے کا اقرار کرتے ہیں نہ کہ وہ جو اس کا اقرار نہیں کرتے۔ اور اس کے اصحاب امر کا انتخاب اور ان کا عزل و نصب ماننے والوں ہی کے ہاتھ میں ہوگا نہ کہ نہ ماننے والوں کے ہاتھ میں۔ یہ امتیاز اسلام خود قائم کرتا ہے۔ اس کا پورا تقاضا تو یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی مجلس شوریٰ صرف مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ لیکن اگر وقت اور حالات کی رعایت سے اس میں غیر مسلموں کی شرکت بھی قبول کرلی جائے تو کم از کم اس کے مسلم ارکان کو مسلمانوں کی رائے سے منتخب ہونا چاہیے، اس میں غیر مسلموں کی رائے کا دخل ہونے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔ اس سے تعصب پیدا ہوتا ہے تو ہو۔ دعوتِ اسلامی میں رکاوٹیں پڑتی ہیں تو پڑا کریں۔ ہم اسلام کے موجد تو نہیں ہیں کہ اپنی مرضی سے جیسا چاہیں پروگرام بنائیں اور دعوتِ اسلامی کا مفاد جس طریقے میں ہم کو نظر آئے اس کو اختیار کرلیں۔ خود اسلام ہی جب اپنے نظام میں مسلم اور غیر مسلم کا امتیاز کرتا ہے تو ہم اسلام سے بڑھ کر اس کے مفاد کو جاننے والے کون ہیں کہ اس امتیاز کو نظر انداز کرکے ایک نرالے اسلامی نظام کی تعمیر کا پروگرام لے کر اٹھیں۔

۴۔ آپ نے موجودہ نیم اسلامی دستور کے جتنے خطرات بتائے ہیں وہ سب صحیح ہیں۔ اس میں فریب کے جتنے پہلو آپ نے گنائے ہیں ان سے بہت زیادہ کے ہم قائل ہیں۔ اس کو پورے اسلامی دستور سے بدلنے کی جدوجہد پر جتنا بھی زور آپ دیں بالکل حق بجانب ہے۔ مگر جب ان چیزوں کے بیان میں آپ

اتنا مبالغہ کرتے ہیں کہ اس نیم دینی دستور کی بہ نسبت لادینی دستور بن جانا قابلِ ترجیح ٹھیرتا ہے تو آپ سے اتفاق کرنا ہمارے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی ریاست کا کفر پر قائم ہونا اور چیز ہے اور مسلمانوں کی قومی ریاست کا کفر پر قائم ہو جانا بالکل ایک دوسری ہی چیز۔ ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اگر شروع ہی میں پاکستان کی اس نوزائیدہ ریاست کو اس راستے پر جانے سے روکنے کی کوشش شروع نہ کر دی جاتی اور مسلمانوں کے قومی جذبات کو اسلامی ریاست کے مطالبے کی طرف نہ موڑ دیا جاتا تو یہاں تھوڑی ہی مدت کے اندر اسلامی نظام کی جدوجہد کے راستے میں موجودہ حالت کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ سخت مشکلات پیدا ہو جاتیں۔ یہ کوئی عقلمندی نہیں ہے کہ آدمی محض کوہ کنی کے ذوق میں اپنے آگے مشکلات کے پہاڑ قائم ہو جانے دے، پھر ان کو توڑنے کی فکر کرے۔ سب سے بڑی سہولت جو اس نیم دینی دستور کی ساری پُرفریبیوں اور خطرناکیوں کے باوجود ہمارے لیے پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ اب آئینی و جمہوری طریقوں سے مطلوبہ تبدیلی لانے کا راستہ کھل گیا ہے۔ اب ہم صحیح توازن کے ساتھ یہ کوشش کر سکتے ہیں کہ ایک طرف باشندگانِ ملک کے افکار و تصورات اور اخلاقی قدروں کو بدلتے چلے جائیں اور دوسری طرف جتنی جتنی یہ تبدیلی ہوتی جائے اسی تناسب کے ساتھ ہم انتخابات پر اثر انداز ہو کر وہ طاقت پیدا کرتے جائیں جس سے ملک کے نظامِ زندگی کو عملاً اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے لیے ریاست کے ذرائع استعمال کیے جا سکیں۔ یہاں تک کہ اس تدریجی نشوونما سے ایک وقت وہ آجائے جب معاشرہ اور ریاست دونوں ٹھیک اسلام کے مطابق ہو جائیں۔ خالص لادینی دستور بن جانے کی صورت میں یہ راستہ ہمارے لیے بالکل بند رہتا۔ ہمیں اس مقصد کے لیے دوسرے بدرجہا زیادہ کٹھن راستے ڈھونڈنے پڑتے۔ اور پھر بھی آخر وقت تک یہ سوال ہمارے لیے سخت پریشان کن رہتا کہ وہ آخری فعل (FINAL ACT) کیا ہو جس سے ریاست کی کافرانہ نوعیت عملاً اسلامی نوعیت میں تبدیل ہو جائے۔

علاوہ بریں یہ بات کہ ہم نے پچھلے آٹھ نو سال کی جدوجہد میں صرف اتنا ہی کام کیا ہے کہ ریاست کو ایک قطعی لادینی ریاست بن جانے سے روک دیا اور ایک نیم دینی دستور بنوا لیا، ایک بہت بڑی غلط فہمی اور اصل حقیقت کا بڑا غلط اندازہ ہے۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہماری دستوری جدوجہد محض دستور بنوا لینے کی

جد و جہد تھی ہی نہیں۔ وہ دراصل یہاں دو رجحانات کی کشمکش تھی۔ ایک لادینی رجحان، دوسرا اسلامی رجحان۔ پاکستان کی تخلیق کے بعد جس وقت ہم نے نئے سرے سے اپنی جد و جہد کا آغاز کیا تو پہلا رجحان پوری طرح ملک پر قابض تھا۔ اس کی پشت پر صرف حکومت ہی کے تمام ذرائع نہ تھے بلکہ پوری دنیا کے غالب نظام کا فکری سرمایہ اور ہماری اپنی قوم کے سب سے زیادہ طاقت ور اور ذی اثر طبقوں کا ذہنی اور عملی تعاون بھی تھا۔ اور اسی رجحان کو یہ فیصلہ کرنے کے آئینی اختیارات بھی کلیۃً حاصل تھے کہ اس نوزائیدہ مملکت کا آئندہ نظام کن تصورات اور کن اصولوں پر قائم ہو۔ کیونکہ دستور ساز اسمبلی ایک فرد واحد کے سوا پوری کی پوری اُن لوگوں پر مشتمل تھی جو یا تو بالکل لادینی رجحانات رکھتے تھے یا اسلامی رجحان کے معاملہ میں کم از کم بے پروا تھے۔ دوسری طرف اسلامی رجحان کی پشت پر اسلام کے ساتھ مسلمان عوام کی جذباتی وابستگی کے سوا کوئی دنیوی طاقت نہ تھی، اور اس جذباتی وابستگی کا حال بھی یہ تھا کہ اسے مذہب کے نام پر کوئی نمائشی کھلونا دے کر بہلایا جا سکتا تھا، بلکہ پیٹ اور روٹی کے نام پر اس کا رخ اشتراکیت تک کی طرف موڑ دینا ممکن تھا۔ اسلامی حکومت کی جو مبہم سی خواہش لوگوں میں پائی جاتی تھی اُس کا کوئی واضح تصور ذہنوں میں موجود نہ تھا، حتیٰ کہ اچھے خاصے اہلِ علم اصحاب کے ذہن کی رسائی بھی شیخ الاسلام اور قضاء شرعی سے آگے کسی چیز تک نہ جاتی تھی۔ اس مقام سے جد و جہد کی ابتدا ہو کر موجودہ نیم دینی دستور بننے تک جو نوبت پہنچی تو کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کام بحیثیتِ مجموعی دینی رجحان کی طاقت بڑھنے اور لادینی رجحان کا زور گھٹنے کے بغیر ہی ہو گیا یا ہو سکتا تھا؟ یہ تو ایک صریح پیمانہ ہے اس امر کا کہ اس آٹھ نو سال کی مدت میں دونوں رجحانات کی طاقتوں کا تناسب کس حد تک بدلا ہے۔ آخر یہ نتیجہ محض ایک مطالبۂ دستوری ہی سے تو رونما نہیں ہو گیا ہے۔ جو کچھ آج آپ کے سامنے ہے وہ اس چیز کا نتیجہ ہے کہ عوام کے جذبات کو، جو کسی رُخ پر بھی موڑے جا سکتے تھے، قطعیت کے ساتھ اسلامی رجحان کی طرف موڑ دیا گیا۔ اسلامی نظام اور اسلامی ریاست کا ایک صاف اور واضح تصور اُن کے سامنے لایا گیا۔ ان کے اندر اُس کی اتنی پہچان پیدا کی گئی کہ کسی نمائشی لیبل سے دھوکا نہ کھا سکیں۔ اُن میں اُس کی پیاس نہیں تو کم از کم اتنی طلب پیدا کر دی گئی کہ اس کے سوا کسی چیز پر راضی نہ ہو سکیں۔ اُن کی رائے عام کو ہموار کر کے اسلامی نظام کی پشت اتنی مضبوط کر دی گئی کہ ملک کو کسی اور طرف

لے جانا مشکل ہو گیا اور اب جہاں تک قدم بڑھ چکا ہے اس سے پیچھے ہٹنا بھی آسان نہ رہا۔ پھر ذہین طبقے کو بھی اسلامی نظامِ زندگی، اسلامی قانون اور اسلامی دستور کے بارے میں مطمئن کرنے اور ان کی ذہنی الجھنوں کو دور کرنے کے لیے اچھا خاصا کام کیا گیا جس کی بدولت آج اس طبقے کا جتنا حصہ لادینی نظام کا مؤید ہے اس سے زیادہ حصہ اسلامی نظام کی طرف مائل ہے۔ اس پر مزید یہ کہ اسی مدت میں اسلام کے لیے عملاً کام کرنے والوں اور ان کا ساتھ دینے والوں کی تعداد میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا جس کو اس جدوجہد کے آغاز کی حالت کے مقابلے میں دیکھا جائے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آج اس رجحان کی خدمت کے لیے پہلے سے بہت زیادہ ہاتھ اور دماغ اور وسائل فراہم ہو چکے ہیں۔ یہ سب کچھ نیم دینی دستور بنوا کر ختم نہیں ہو گیا ہے۔ یہی ہمارے آگے کے کام کا سرمایہ ہے۔ خدا کے فضل کے بعد اگر کسی چیز کے بل بوتے پر ہم آگے کی تعمیر و اصلاح کے لیے کچھ سوچ سکتے ہیں تو وہ یہی پچھلے کام کا فراہم کیا ہوا سرمایہ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں مبالغہ جتنا غلط ہے اتنا ہی غلط اس کا کم اندازہ کرنا بھی ہے۔ حقیقت سے زیادہ اندازہ کرنے کا نتیجہ اگر یہ ہو گا کہ ہم وہ کام کرنے کے لیے چل پڑیں گے جس کی طاقت ہمارے پاس نہیں ہے تو حقیقت سے کم اندازہ کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جو کچھ ہم اس وقت کر سکتے ہیں اس کے لیے اقدام کرنے سے رہ جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اس کے مواقع پھر نہ ملیں یا آج کی بہ نسبت بہت کم رہ جائیں۔

۴۔ جماعت اسلامی کے جن لوگوں نے اپنی باتوں سے یا اپنے طرزِ عمل سے آپ کو اس شکایت کا موقع دیا ہے جو آپ نے اپنے عنایت نامے کے آخری حصہ میں بیان کی ہے ان کے حال پر مجھے افسوس ہے اگر ہمیں معلوم ہو کہ وہ کون لوگ ہیں تو ہم تحقیق کریں گے اور ان کی اصلاح کے لیے کوشش میں دریغ نہ کریں گے۔ مگر جماعت نے بحیثیت مجموعی نہ تو موجودہ دستور کے ناقص پہلو بیان کرنے اور کامل اسلامی دستور کا تصور دلانے میں کوتاہی کی ہے اور نہ کبھی عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے کہ اسلامی دستور تو پورا کا پورا بن چکا ہے، اب صرف طریقِ انتخاب کی آخری مہم باقی ہے۔ دوسری جن کوتاہیوں کا آپ نے ذکر فرمایا ہے انہیں دور کرنے کی ان شاء اللہ ضرور کوشش کی جائے گی بہرحال انسانی کام بالکل معیارِ کمال پر پہنچے ہوئے تو نہیں ہو سکتے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا اگر آپ جماعت کی کوتاہیوں سے بھی مجھے خبردار کرتے رہیں اور میری اپنی کوتاہیوں سے بھی۔ خصوصیت کے ساتھ مجھے یہ ضرور بتائیے کہ میں نے کہاں پیش رو دوں کے کاموں کی غلط ترجمانی کی ہے یا اسلاف کی اسلامی بصیرت اور خلوص کو مشکوک بنایا ہے۔ میں اپنی ہر اس بات کی اصلاح

کے لیے تیار ہوں جس کے غلط ہونے پر مجھے مطمئن کر دیا جائے۔ آپ یقین کریں کہ ایسا کوئی کام مجھ سے ہوا بھی ہے تو دانستہ نہیں ہوا ہے۔

اسلامی ریاست

اسلامی معاشرہ اور اسلامی قومیت کے عوامل

آج سے سات سال قبل "ترجمان" (ذی الحجہ ۱۳۸۶ھ) میں "اسلامی ریاست" کے مختلف مباحث کی اشاعت کا آغاز ہوا تھا۔ اس وقت تک اس سلسلۂ مباحث کے چار اجزا "ترجمان" میں اور الگ کتابی شکل میں بھی چھپ چکے ہیں۔ بیچ میں یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے رُک گیا تھا۔ اب مولانا اصلاحی صاحب نے اسے دوبارہ شروع کیا ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کے اسباب فراہم کرے۔ وبیدہ التوفیق

علمائے سیاست، ریاست کا تدریجی ارتقاء اس طرح بیان کرتے ہیں کہ خاندانوں کے اجتماع سے معاشرہ وجود میں آتا ہے، معاشرہ اپنے ایک خاص دور میں قومیت کا رُوپ دھارن کرتا ہے اور جب قومیت اپنے سیاسی شعور کے لحاظ سے اس قدر ترقی کر جاتی ہے کہ اس کے تمام افراد ایک بالاتر اقتدار کی اطاعت کرنے لگتے ہیں تو ریاست وجود میں آجاتی ہے۔

اس تدریج کی روشنی میں ریاست کے اوصاف اور اس کی خصوصیات پر غور کرنے سے پہلے خود معاشرہ اور قومیت کی حقیقت اور ان کے اوصاف و خصوصیات کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجائے کہ قومیت کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں، کن چیزوں سے اس کے مختلف اجزاء میں اشتراک و اتحاد پیدا ہوتا ہے، وہ کیا محرکات ہیں جو ان میں باہم ربط و اتصال کا جذبہ پیدا کرتے اور ایک دوسرے کے لیے قربانی اور ایثار پر اُبھارتے ہیں تو اس سے خود ریاست کی حقیقت اور اس کے اجزائے ترکیبی میں اتصال و اشتراک کی نوعیت اچھی طرح سمجھ میں آسکے گی۔ قومیت اور ریاست میں وہی نسبت ہے جو نسبت بنیاد اور عمارت میں ہے۔ اگر بنیاد کا پورا نقشہ واضح ہو تو اصل عمارت کی

نوعیت سمجھ لینے میں کوئی زحمت پیش نہیں آئے گی۔ بالخصوص عمارت کے استحکام کے نقطۂ نظر سے اگر اس کا جائزہ لینا ہو تو پھر دیکھنے اور سمجھنے کی اصلی چیز بنیاد ہی ہے نہ کہ عمارت۔ اس وجہ سے پہلے ہم یہ بتائیں گے کہ قومیت کن عوامل کے اشتراک سے پیدا ہوتی ہے، ضعف اور قوت کے لحاظ سے ان کے کیا درجے ہیں، ان عوامل سے متعلق جدید اور قدیم نظریات میں کیا اختلاف ہے۔ پھر اس امر پر غور کریں گے کہ ایک عام قومیت اور ایک اسلامی قومیت میں کیا فرق ہے اور ان دونوں سے پیدا ہونے والی ریاستوں کے مزاج اور ان کے اطوار پر اس فرق کے کیا اثرات مترتب ہوتے ہیں؟

قومیت کے عوامل قومیت چند چیزوں کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے۔ نسل، زبان، جغرافی یک جائی، روایات اور مذہب

انسانوں کے کسی گروہ میں اگر یہ چیزیں مشترک ہوں اور اس کے افراد میں ان کے اشتراک کا شعور بھی زندہ ہو تو قدرتی طور پر وہ ایک دوسرے کی ہمدردی و حمایت کرتے ہیں، ایک دوسرے کے جذبات و احساسات کو سمجھتے ہیں، رنج و راحت اور دکھ سکھ میں اپنے کو ایک دوسرے کا شریک خیال کرتے ہیں اور زندگی کے مسائل پر ایک ہی طرز پر سوچتے ہیں۔

نسل کا اشتراک حمایت و حمیت کا سب سے بڑا محرک ہے، زبان کا اشتراک ایک دوسرے کو سمجھنے اور سمجھانے میں سب سے بڑا معاون ہے، جغرافی یک جائی دوسروں کے مقابل میں اپنے تحفظ اور مدافعت کا احساس پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر عامل ہے اور تہذیب و روایات کا اشتراک طرزِ فکر میں ہم آہنگی و ہم رنگی پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ کارگر ہے۔ جہاں اشتراک کے یہ تمام عوامل موجود ہوں وہاں اتحاد و ارتباط کا جذبہ اور حمیت و حمایت کا ولولہ پایا جانا ایک بالکل فطری چیز ہے۔ یہ جذبہ ارتباط و اتحاد پیدا کرنے کے علاوہ دوسروں کے مقابل میں اپنے ایک علیحدہ تشخص کا احساس اور تفوق و بالاتری کا شعور بھی ابھارتا ہے، یہاں تک کہ جن لوگوں کے اندر اشتراک کے یہ سارے پہلو جمع ہو جاتے ہیں ان کے اندر نہایت پُرزور خواہش اس بات کی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ ہمارے سارے معاملات ہمارے اپنے ہاتھ میں ہوں، اپنے امر و نہی کے مالک ہم خود ہوں، کسی غیر کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ

وہ ہمارے معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی کر سکے۔

اس اشتراک کے لیے یہ لازم نہیں ہے کہ جہاں یہ پایا جائے وہاں سرے سے کوئی اختلاف یا تصادم واقع ہی نہ ہو۔ شخصی اور خاندانی اغراض و مصالح میں برابر ٹکراؤ ہوتا رہتا ہے لیکن ایک بالا تر اقتدار اس طرح کی ساری آویزشوں کو رفع کرتا رہتا ہے اور لوگ اس کے فیصلوں کے آگے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اور یہ سرِ تسلیم خم کرنا صرف اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ ایک قاہر اقتدار کے آگے کسی کے لیے دم مارنے کی گنجائش نہیں ہوتی ہے بلکہ اس میں بڑا دخل اس شعور کو بھی ہوتا ہے کہ قومیت کے بڑے فوائد سے متمتع ہوتے رہنے کے لیے ناگزیر ہے کہ قومیت کا ہر جزو کسر و انکسار کے اصول پر اپنے بعض چھوٹے فوائد کو قربان کرنے کے لیے تیار رہے۔ اگر ہر شخص اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کی قربانی پر راضی نہ ہوگا تو بالآخر اسے بڑے بڑے مفادات سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ یہ شعور ایک خالص سیاسی شعور ہے اور درحقیقت یہی شعور ہے جو کسی قومیت کو ایک حقیقی وجود سیاسی کی حیثیت بخشتا ہے۔

قومیت کا نیا نظریہ | دنیا میں ابتدا سے قومیت کے مذکورہ عوامل ہی اصلی عوامل کی حیثیت سے مسلّم رہے ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عوامل بالکل فطری اور قدرتی ہیں لیکن سائنس کی ترقیوں نے ان عوامل میں سے اکثر کو شہر بدر کر کے اب ساری اہمیت صرف جغرافی حدود یا دوسرے الفاظ میں وطن کو دے دی ہے۔ وطن کو ایک اہم عامل کی حیثیت تو پہلے بھی حاصل تھی لیکن اب اصلی عامل یہی ہے۔ اگر اس عامل کے ساتھ دوسرے عوامل بھی موجود ہوں تو بہتر لیکن اگر یہ موجود ہے اور دوسرے عوامل موجود نہیں ہیں تو اسی کو اصل قرار دے کر دوسرے عوامل اب اسی سے مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

وطن کے ایک فطری عامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جس نوعیت سے اب اس کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے وہ فطرت کے تقاضے سے زیادہ ضرورت کی ایجاد ہے۔ سائنس کی ترقیوں نے اب قوموں میں تحفظ اور مدافعت کے احساس کو دوسرے تمام احساسات پر غالب کر دیا ہے اس وجہ سے قومیں اب جغرافی حدود کو بہت زیادہ اہمیت دینے لگی ہیں۔ اب نسل، زبان اور روایات کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی اہمیت دریاؤں، سمندروں، پہاڑوں اور دوسرے

قدرتی دفاعی حصارات کو دی جاتی ہے۔ پہلے قومیتیں عموماً زمین کے اتنے ہی خطہ پر قناعت کرتی تھیں جتنے کو وہ اپنی نسل اور اپنی تہذیب اور روایات کا گہوارہ سمجھتی تھیں، اس دائرے سے آگے بڑھنے کی خواہش صرف وہی قومیتیں کرتی تھیں جو غیر معمولی طور پر حوصلہ مند ہوتی تھیں اور دوسروں کو اپنا محکوم بنانا چاہتی تھیں۔ لیکن اب ہر قومیت اپنے وطن کے حدود، اقتصادی اور دفاعی نقطۂ نظر سے معین کرتی ہے اور اس پورے دائرے پر بہر حال قابض رہنا چاہتی ہے اگرچہ خود اس کا اپنا وجود اس کے وطن کی قبا سے چھوٹا ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ اپنی قامت کے لحاظ سے اپنی قبا بنائے کوشش یہ کرتی ہے کہ کھینچ تان کر کسی طرح اپنے وجود کو اس قبا کے مناسب بنالے۔ اپنے آپ کو مصنوعی طور پر بڑھانے کا واحد طریقہ جو وہ اختیار کر سکتی ہے یہی ہے کہ اپنے وطن کے جو حدود اس نے قرار دے لیے ہیں اس کے اندر جو دوسری قومیتیں ہیں ان کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش کرے۔ ان کے اندر خود ان کی نسل، خود ان کی زبان، اور خود ان کے مذہب یا روایات کے لیے جو احساسات پائے جاتے ہیں ان کو دبائے اور ایک وطنی قومیت کے نظریہ کے تحت خود اپنی زبان، اپنے مذہب، اپنی روایات اور اپنے اشخاص و رجال کے عزت و احترام کو ان کے ذہنوں پر مسلط کرے تاکہ وہ ظاہر و باطن دونوں میں غالب قومیت کے ہم رنگ ہو جائیں۔

مذکورہ عوامل کے نقائص | مذکورہ عوامل کے عوامل قومیت ہونے سے تو جیسا کہ عرض کیا گیا، انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن مجرد ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس کے مزاج میں چند خرابیاں لازماً موجود ہوتی ہیں۔

پہلی خرابی تو یہ ہے کہ اس طرح کی قومیت نہایت تنگ نظر ہوتی ہے۔ ہر معاملہ میں اس کے زاویۂ نگاہ پر نسلی اور قومی رنگ غالب ہوتا ہے۔ اس کی ساری توجہ کا مرکز پوری نسل انسانی میں سے صرف ایک محدود حصہ ہوتا ہے اور اسی کو وہ پوری انسانیت سمجھتی ہے۔ اس کے لیے یہ بالکل ناممکن ہوتا ہے کہ وہ کبھی تمام انسانوں کے معاملہ پر اس نقطۂ نگاہ سے غور کر سکے کہ یہ سب ایک ہی آدم و حوا کی اولاد، ایک ہی جسم کے اعضاء و جوارح، ایک ہی خاندان کے افراد اور ایک ہی برادری کے اجزاء و ارکان ہیں۔

ایک قلیل حصہ کے سوا ساری دنیا کے ساتھ اس کے تعلقات ہمدردانہ و مشفقانہ ہونے کے بجائے یا تو رقیبانہ و حاسدانہ ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ مصلحت پرستانہ۔ یہ اپنے سوا سب کی بدخواہ اور دشمن ہوتی ہے اور یہ بدخواہی و دشمنی اس کے دایرے میں عیب کے بجائے ہنر سمجھی جاتی ہے اور اس کو قوم پرستی کے معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

دوسری خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ یہ نہایت گہرے نسلی تعصب کی مریض ہوتی ہے۔ یہ تعصب اس کے دایرے میں مرض کے بجائے صحت و قوت کی علامت خیال کیا جاتا ہے۔ اس تعصب ہی کو وہ اپنے استحکام کا ذریعہ سمجھتی ہے اس وجہ سے قومیت کے تمام اجزا کے اندر اس جذبے کا برابر بھڑکتے رہنا عین مطلوب ہوتا ہے۔ اس آگ کو بھڑکائے رکھنے کے لیے اس کی ماضی کی روایات کے اندر سے بھی ایندھن فراہم کیا جاتا ہے اور اس کے مستقبل کے حوصلوں سے بھی اس کو ہوا دی جاتی ہے اور جو لوگ زیادہ سے زیادہ مقدار میں یہ اسبابِ اشتعال فراہم کرتے ہیں وہی قوم کے اصلی خیر خواہ اور حقیقی ہیرو سمجھے جاتے ہیں۔ اس آگ کو مشتعل رکھنے کے لیے اگر مزید ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو عدل و انصاف، رحم و ہمدردی، انسانیت اور رواداری کے معروف اقدار بھی اس میں جھونک دیے جاتے ہیں اور معاملہ اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ "میری قوم، خواہ حق پر ہو یا باطل پر"۔ اس حد پر پہنچ جانے کے بعد یہ قومیت ہی حق و باطل کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ جو چیز اس کے حق میں جاتی ہے وہ تو حق بن جاتی ہے اور جو اس کے مفاد کے خلاف پڑتی ہے وہ باطل بن جاتی ہے۔ بڑا سے بڑا جھوٹ، بڑا سے بڑا ظلم اور بڑا سے بڑا فساد نیکی اور انصاف بن جاتا ہے اگر یہ کسوٹی اس کو نیکی اور انصاف قرار دیتی ہو اور واضح سے واضح سچائی اور قطعی سے قطعی انصاف کی بات بھی غداری اور بغاوت ٹھیرا دی جاتی ہے اگر یہ کسوٹی اس کو غداری اور بغاوت ٹھیرا دے۔ اس طرح کی قومیت کے دایرے کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ کوئی شخص اس کسوٹی سے بالاتر کسی اور معیار حق و باطل کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہہ سکے یا کوئی کام کر سکے۔ اگر وہ ایسی جرأت کرے تو عجب نہیں کہ اس کو پھانسی کی سزا ملے اگرچہ وہ سقراط ہی کے درجہ ہی کا آدمی کیوں نہ ہو۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ یہ از خود پھیلنے اور دوسروں کو قائل کر کے ان کو جیت لینے کی فطری صلاحیت سے بالکل محروم ہوتی ہے۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں۔ یا تو وہ اپنے خول کے اندر سمٹی سمٹائی پڑی رہے یا پھر جارحانہ عزم اور فاتحانہ حوصلہ کے ساتھ اٹھے اور جن پر اس کا زور چلے ان کو زیرنگیں کر لے۔ ان دو صورتوں کے سوا اس کے لیے کوئی تیسری راہ نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے یہ یا تو دوسروں سے مار کھاتی ہے اگر اس کا مزاج منفعل اور شرمیلا ہوتا ہے یا دوسروں سے لڑتی بھڑتی رہتی ہے اگر اس کا مزاج جارحانہ ہوتا ہے۔ اس کے پاس دلوں کو جیتنے اور عقلوں کو قائل کرنے کے لیے کوئی چیز بھی نہیں ہوتی کہ جو لوگ اس کے دائرے سے باہر ہیں وہ اس کی منطق اور حجت سے مفتوح ہو سکیں۔ یہ طاقت صرف نظریات اور اصولوں میں ہوتی ہے کہ اگر وہ عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو وہ دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور لوگ ان .... کے قائل ہو کر خود ان کے علم بردار اور ان کے پیش کرنے والوں کے ساتھی بن جاتے ہیں۔ لیکن نسل اور نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر آخر دوسری نسل والوں کے لیے کون سی کشش ہو سکتی ہے؟ دوسروں کے اندر اس کے لیے اگر کوئی چیز ہو سکتی ہے تو تعصب کے جواب میں تعصب، احساس برتری کے جواب میں احساس برتری اور نفرت کے مقابل میں نفرت ہی ہو سکتی ہے۔ اصول اگر عقل و فطرت پر مبنی ہوں تو ساری دنیا پر چھا سکتے ہیں اور تمام نسلِ انسانی، رنگ و خون اور زبان و تہذیب کے سارے اختلافات کے علی الرغم ان کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھول دیتی ہے لیکن کسی خاص نسل کے دعوے داروں کے آگے از خود لوگ کیوں سپر انداز ہو جائیں؟ اپنے اس نقص کے سبب سے کسی نسلی قومیت کے اندر یہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وہ کسی جہانی ریاست کی بنیاد رکھ سکے۔ اس طرح کی کسی بلند حوصلہ قومیت نے اگر کبھی دنیا پر چھانے کی کوشش کی بھی ہے تو وہ آندھی اور طوفان کی طرح چھائی ہے اور طوفان ہی کی طرح غائب بھی ہو گئی ہے۔ سکندر، نپولین، چنگیز اور تیمور کی فتوحات کی وسعت سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اقدام جتنا تیز تھا اس سے زیادہ تیز ان کی رجعت تھی۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ نسل کا اشتراک قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے کوئی بہت

زیادہ قوی عامل نہیں ہے۔ یہ تعاون و ہمدردی اور حمیت و حمایت کا محرک اسی حد تک ہوتا ہے جس حد تک کسی نسل کے افراد میں ہم نسلی کی یادداشت تازہ ہو۔ یہ یادداشت چند پشتوں تک تو بلاشبہ باقی رہتی ہے لیکن اس سے آگے جا کر یہ اتنی مضمحل اور بے جان ہو جاتی ہے کہ اس کی حیثیت ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ اول تو کسی نسل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا ہی مشکل ہے کہ وہ اختلاط سے محفوظ ہے، یہ دعویٰ اگر کیا جا سکتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ان قبائلی نسلوں ہی کی نسبت کیا جا سکتا ہے جن میں نسل کے تحفظ کا اہتمام بھی ہے اور جو اپنے محدود سیاسی اغراض کے لیے اس نسلی رابطہ کے شعور کو اپنے افراد کے اندر تازہ رکھنے کی بھی کوشش کرتی ہیں، دوسروں کے اندر اس کی حیثیت جیسا کہ عرض کیا گیا ایک واہمہ اور خیال سے زیادہ نہیں ہوتی اس وجہ سے قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے اس کو کچھ ایسی اہمیت نہیں دی جا سکتی اور اس کے بل پر کوئی بہت مضبوط اور وسیع قومیت قائم نہیں ہو سکتی۔

پانچویں خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ ان عوامل سے جو قومیت وجود میں آتی ہے اس میں خلطِ غالب چونکہ نسل کا شعور ہی ہوتا ہے، زبان، تہذیب، روایات، ادب اور دوسرے عوامل سب پر اسی کا رنگ غالب ہوتا ہے اس وجہ سے مذہب بھی اگر ان کے ساتھ شامل ہوتا ہے تو وہ بھی انہی کا ایک تابع مہمل بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی نسلی قومیت کی مذکورہ خرابیوں کی کوئی اصلاح کرنے کے بجائے ان میں کچھ اضافہ ہی کر دیتا ہے۔ ہماری مراد یہاں صرف انہی مذاہب سے نہیں ہے جو مشرکانہ عقائد کے تحت انسانوں نے خود ایجاد کیے ہیں، یہ مذاہب تو ہوتے ہی قومی اور نسلی ہیں، بلکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ایک صحیح مذہب بھی نسلی عصبیت کے زیر سایہ ایک نسلی مذہب بن کے رہ جاتا ہے اور اپنی تمام عقلی اور فطری خوبیاں آہستہ آہستہ کھو بیٹھتا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ واضح مثال یہود کا مذہب ہے۔ بنی اسرائیل نے چونکہ کبھی اپنی نسلی قومیت کے خول سے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اس وجہ سے انہوں نے اپنے مذہب کو بھی، جو اصلاً ایک خدائی مذہب تھا تراش خراش کر اپنی قومیت ہی کے سانچے میں ڈھال لیا۔ توریت میں یہ جو بار بار آتا ہے کہ "خداوند خدا اسرائیل کا خدا" اور "اے اسرائیل تو

خدا کا پہلو ٹھا ہے"۔ یہ سب اسی عصبیت نسلی کی پیدا کردہ تعبیریں ہیں۔ انہوں نے مذہب سے روشنی لینے اور اور اس روشنی سے اپنی نسلی عصبیت کی تنگ نظری دور کرنے کے بجائے اپنے مذہب کو بھی اپنی ہی طرح تنگ نظر اور متعصب بنا ڈالا اور یہ مذہب بجائے اس کے کہ ان خرابیوں کے دور کرنے میں کچھ معین ہوتا جو نسل و نسب سے بنی ہوئی قومیت کے اندر مضمر ہیں الٹا ان خرابیوں کو بھلائیاں ثابت کرنے میں ان کا ایک غیبی مددگار بن گیا۔

اس میں چھٹی خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کے مطالبات اور فطرتِ سلیم اور عقلِ سلیم کے مقتضیات ایک خاص دایرہ ہی تک ہم آہنگ رہ سکتے ہیں۔ اس خاص دایرے سے آگے بڑھ کر عموماً ان کو ہم آہنگ رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس دایرے سے آگے قومیت کے تقاضے صریحاً انسانیت کے وسیع مفادات، اخلاق کے معروف مسلمات اور انصاف کے ہمہ گیر اصولوں سے متصادم ہوتے ہیں۔ قومیت کے علم بردار اس تصادم کو دور کرنے کے لیے قومیت کے مفاسد کا اعتراف کرنے کے بجائے کوشش اس بات کی کرتے ہیں کہ قومیت ہی کی اساس پر انسانیت، اخلاق اور انصاف کا ایک بالکل ہی نرالا فلسفہ تیار کر دیں۔ یہ فلسفہ تیار تو ہو جاتا ہے، پڑھے لکھے ذہین لوگ اگر آمادہ ہو جائیں تو کیا نہیں کر سکتے، لیکن یہ فلسفہ سلیم الفطرت انسانوں کو کبھی اپیل نہیں کرتا۔ اس کے لیے مثال کے طور پر سولھویں صدی کے سیاسی فلسفی میکاولی کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ اس طرح کے فلسفے اہل سیاست کی امنگیں پوری کرنے کا وقتی طور پر ایک ذریعہ تو ضرور بن جاتے ہیں لیکن انسان چونکہ ایک نسلی حیوان ہی نہیں بلکہ اپنی ایک عقلی و اخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے اور اس کا یہ پہلو اس کے تمام دوسرے پہلوؤں پر غالب ہے اس وجہ سے اندر سے طبیعتیں ان سے برابر ابا کرتی رہتی ہیں اور جس چیز پر کسی معاشرہ کے معقولیت پسند لوگ مطمئن نہ ہوں اس کے بودے پن کو کتنے دنوں تک چھپایا جا سکتا ہے؟

وطنی قومیت کے مفاسد وطنی قومیت کے اندر مذکورہ بالا مفاسد کے علاوہ کچھ مزید مفاسد بھی ہیں جن کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں لیکن اصل بحث سے پہلے اس حقیقت کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ وطن کا ایک عامل وطنیت ہونا ایک علحدہ چیز ہے اور وطن کو اساس بنا کر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ

قومیت کا کنبہ جوڑنا ایک علٰحدہ شے ہے۔ جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے وہ بالکل مقتضائے فطرت ہے۔ جس طرح ہر شخص کو اس کا گھر عزیز ہوتا ہے، اس کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے اس کی روایات وابستہ ہوجاتی ہیں، اس کی حفاظت اور اس کے اوپر اپنا حق قائم رکھنے کے لیے وہ بسا اوقات اپنا مال اور اپنی جان سب کچھ قربان کردیتا ہے اور ایسا کرگذرنا ہر حق پسند کے نزدیک ایک مستحسن اور غیرت مندانہ کام سمجھا جاتا ہے۔ اُسی طرح ہر قومیت کو اس کا وطن عزیز و محبوب ہوتا ہے۔ وہ اس کو اپنی جنم بھومی اور مادر وطن سمجھتی ہے، اس کو اپنی تہذیب اور اپنے تمدن کا گہوارہ خیال کرتی ہے، اس کے چپہ چپہ پر اس کے اسلاف کی عظمت اور اس کے آباء و اجداد کے کارناموں کی تاریخ ثبت ہوتی ہے، اس کے دریا اور پہاڑ اور اس کے نشیب و فراز سب کی زبانوں پر اس کی روایتیں اور حکایتیں ہوتی ہیں، اس کے پہاڑوں میں اس کی زندگی کے سرچشمے، اس کے کھیتوں اور باغوں میں اس کی معاش و معیشت کے ذخیرے اور اس کی وادیوں اور اس کے کہساروں میں اس کی خوشیاں اور اس کی بہاریں ہوتی ہیں اس وجہ سے ہر قوم اپنے وطن کو اپنی مشترک دولت سمجھتی ہے اور یہ اشتراک اس کے اندر ہم وطنی کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ان کو وطن سے مشترک استفادہ اور اس کی مشترک حفاظت و صیانت کے لیے برابر جوڑے رکھتا ہے۔ یہ چیز عین تقاضائے فطرت ہے۔ نہ یہ عقل کے خلاف ہے اور نہ مذہب و اخلاق کے۔ لیکن دوسری چیز یعنی وطن کو اساس قرار دے کر مختلف قومیتوں کو ایک متحدہ قومیت میں جوڑ ڈالنا ایک بالکل مختلف چیز ہے جس کی خرابیاں بالکل واضح ہیں۔

وطن کی بنیاد پر مختلف قومیتوں سے ایک متحدہ قومیت جو بنتی ہے اس میں اصلی مطمح نظر تو یہ ہوتا ہے کہ ایک وطن میں رہنے بسنے والی ایک سے زیادہ قومیتیں وطن کے سوا دوسرے عواملِ قومیت ــــ نسل، زبان، کلچر، روایات اور مذہب ــــ کو جو ان کے اندر اپنے الگ الگ تشخص اور اپنی مخصوص انفرادیت کا احساس پیدا کرتے ہیں ختم کردیں اور ان کی جگہ ایک مخلوط نسل، ایک مشترک زبان، ایک مشترک ثقافت اور ایک مشترک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ بات کہنے میں بھی بڑی بھونڈی معلوم ہوتی ہے اور عملاً بھی بہت بعید از قیاس نظر آتی ہے اس وجہ سے کہی یوں جاتی ہے کہ مختلف قومیتیں

الگ الگ تشخصات کو اگر محفوظ رکھنا چاہیں تو اپنے الگ دایروں کے اندر محفوظ رکھیں لیکن اجتماعی و سیاسی دایرے میں ایک ہی قوم کی حیثیت سے نمایاں ہوں اور اپنے انفرادیت پسندانہ رجحانات و عوامل کو اس میں مُخل نہ ہونے دیں۔ اٹھارویں صدی سے پہلے پہلے تو عملاً یہی صورت تھی کہ غالب اور فتحمند قومیت مغلوب قومیت کے ان تمام تشخصات کو تقریباً ختم کر دیتی تھی جو اس کے انا کو زندہ رکھنے والے خیال کیے جاتے تھے لیکن اٹھارویں صدی میں نپولین کی فتوحات اور اس کے بعد پہلی جنگِ عظیم نے مختلف اسباب سے جن کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی، قومیتوں کے اندر اپنے امتیازی تشخصات کو زندہ اور باقی رکھنے کا احساس اتنا قوی کر دیا کہ غالب قومیتوں کے لیے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں رہا۔ اب اگرچہ ایک نظریہ کی حیثیت سے یہ مسلّم ہے کہ ہر قومیت کو اپنی ہستی، اپنی زبان، اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کو باقی رکھنے کا حق ہے اور یہ بات بظاہر نہایت اچھی بھی معلوم ہوتی ہے لیکن اس کا سارا حسن صرف کاغذ کے صفحات ہی پر ہے، عمل میں آکر اس کی یہ ظاہری چمک دمک بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی تمام اندرونی خرابیاں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ ہم یہاں اس کی بعض نمایاں خرابیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی پہلی خرابی تو یہ ہے کہ یہ قومیت متضاد عناصر کا ایک مجموعہ ہوتی ہے۔ بظاہر تو یہ عناصر ایک ہی بندھن میں باندھ دیے جاتے ہیں لیکن بباطن ان کی امنگیں اور ان کے حوصلے ایک دوسرے سے بالکل مختلف رہتے ہیں۔ جہاں نسل، زبان، تہذیب، ادب اور مذہب کے اتنے اختلافات موجود ہوں وہاں صرف ہم وطنی کا رشتہ ان کو باہم جوڑے رکھنے میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتا۔ ان کے درمیان اختلاف اور نزاع کے جو محرکات موجود ہوتے ہیں وہ برابر اپنا عمل کرتے رہتے ہیں اور کبھی ان کو ایک قوم کی طرح پوری یک جہتی کے ساتھ کسی قومی نصب العین کے لیے کام نہیں کرنے دیتے۔ یہ قومیت کامیاب صرف اسی صورت میں ہوتی ہے جب تضاد کے یہ اسباب یا تو سطحی ہوں، یا پوری طرح دبا دیے گئے ہوں، یا دوسرے عناصر کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اتنے ناقابل لحاظ ہوں کہ غالب عصبیت کے مقابل میں وہ کان دبائے پڑے رہنے پر مجبور اور اس کی ہاں میں ہاں ملاتے رہنے ہی میں اپنی سلامتی سمجھتے ہوں۔

اس کی دوسری خرابی یہ ہے کہ اس قومیت کی تشکیل کرنے والے مختلف اجزا مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے پاس جو قیمتی ورثہ خود ان کی قومی روایات، قومی ادب، اور اپنے آبائی دین کا ہے اس کو تو اجتماعی وسیاسی زندگی سے خارج کر کے سڑنے اور گلنے کے لیے چھوڑ دیں اور اس کی جگہ پر ہر چیز ایک مصنوعی شکل میں قبول کرنے پر راضی ہوں۔ یہ قربانی صرف انہی عناصر کو نہیں کرنی پڑتی ہے جو عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں بلکہ بسا اوقات اپنے دوسرے ساتھی یا ساتھیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شریکِ غالب کو بھی یہ قربانی کرنی پڑتی ہے۔ ادب میں رجحانات بدلتے ہیں، زبان کا ڈھانچہ متغیر ہوتا ہے، روایات کا ایک نیا ملغوبہ تیار ہوتا ہے، رسوم میں بالکل بے گانہ آمیزشیں ہوتی ہیں، تاریخ ایک نیا قالب اختیار کرتی ہے، جو عدو سمجھے جاتے تھے وہ ہیرو بنتے ہیں، جو ہیرو خیال کیے جاتے تھے بسا اوقات ان کے نام کتابوں کے صفحات اور ذہنوں کی الواح سے کھرچ کھرچ کر نکالے جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ مصیبت اس وطنی قومیت کے ہاتھوں مذہب پر آتی ہے۔ مذہب ایک قوی ترین عامل قومیت ہے اور سطحی مفادات کے آگے مشکل ہی سے سرِتسلیم خم کرتا ہے۔ اس وجہ سے قومیت کی تشکیل میں اس کو سب سے بڑا مانع قرار دے کر اس کا علاج یہ سوچا گیا ہے کہ اس کو اجتماعی وسیاسی زندگی سے بالکل ہی خارج کر کے مسجد، یا مندر، یا کلیسا کے اندر بند کر دیا جائے۔ اس لادینیت کے بغیر وطنی قومیت کا ڈھانچہ کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

اس میں تیسری خرابی یہ ہے کہ غالب قومیت کے اندر اگر نسلی اور مذہبی عصبیت پوری طرح جڑ پکڑے ہوئے ہوتی ہے تو وہ وطنی قومیت کا روپ دھارن کر کے بھی دوسرے شریکوں کے مقابل میں اجتماعی سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مفاد اور اپنے رنگ کو غالب رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوسرے اگر اپنے حقوق کا نام لیں، اپنی زبان کا ذکر کریں، اپنی تہذیب کا رونا روئیں، اپنے مذہب کا حوالہ دیں تو اس کو گروہی تعصب، انتشار پسندی اور ملک و وطن کے ساتھ غداری پر محمول کیا جاتا ہے لیکن شریکِ غالب دھڑتے کے ساتھ ساری چیرہ دستیاں کرتا ہے لیکن مجال نہیں ہے کسی کی کہ اس کے خلاف زبان ہلا سکے۔ اس اس صورت حال کی بہترین مثال بھارت کی ہندو اکثریت کا طرزِ عمل ہے۔

اس کی چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض حالات میں شریکِ غالب بھی اس میں شدید نقصان اٹھاتا ہے۔

یہ صورت اس وقت پیش آتی ہے جب شریک غالب عددی اکثریت تو رکھتا ہو لیکن اس کے اندر وحدت اور تنظیم نہ ہو، معاشی اعتبار سے وہ بدحال اور سیاسی اعتبار سے وہ غیر منظم ہو، اس کے لیڈر سادہ لوح یا ابن الوقت ہوں، اس کے اندر محض مفاد اور اغراض کے لیے بہت سی پارٹیاں بن گئی ہوں جس نے اس کی سیاسی طاقت بالکل منتشر ہو گئی ہو اور یہ پارٹیاں محض وقتی مفاد اور حصول اقتدار کے لیے اپنے دشمنوں اور مخالفوں سے سودا بازیاں کر سکتی ہوں۔ ایسی صورت میں عددی اکثریت رکھنے کے باوجود وہ کسی حوصلہ مند اور منظم اقلیت کے ہاتھ میں ایک کھلونا بن کے رہ جاتی ہے۔ یہ اقلیت اپنی ہوشیاری اور سیاسی جوڑ توڑ سے اس کی پارٹیوں کو اپنا آلۂ کار بنا لیتی ہے اور جو مقاصد وہ خود اپنے ہاتھوں پورے کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی وہ ان کے واسطے سے بڑی آسانی سے پورے کر لیتی ہے۔ اس میں بڑی سہولت اس کو اس وقت حاصل ہو سکتی ہے جب اس کو انتخابات میں شریک غالب کے نمایندوں کے انتخابات پر بھی اثر انداز ہونے کا موقع مل جائے۔ اس کی نہایت واضح مثال مشرقی پاکستان میں موجود ہے۔ یہاں مسلمان عددی اکثریت رکھنے کے باوجود اپنی مذکورہ بالا کمزوریوں کے سبب سے ہندوؤں کے لیے ایک چراگاہ بنتے جا رہے ہیں۔ اور اس علاقے میں مخلوط طریقۂ انتخاب رائج ہو جانے کے بعد اقلیت کے اکثریت پر اثر انداز ہونے کے مواقع اس قدر بڑھ جائیں گے کہ اکثریت نہ صرف تہذیب و تمدن اور مذہب کے اعتبار سے سخت نقصان اٹھائے گی بلکہ عجب نہیں کہ ملک کی سالمیت ہی خطرے میں پڑ جائے۔

اس کی پانچویں خرابی اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ قومیت خطرات و مشکلات کے مقابل میں عموماً بہت بودی ثابت ہوتی ہے۔ وطنی عصبیت کا جذبہ ابھارنے کے لیے اگر کوئی محرک سب سے زیادہ قوی ہو سکتا ہے تو وہ کسی مشترک مصیبت کا ظہور یا اس کے ظہور کا خطرہ ہی ہو سکتا ہے لیکن یہ مشترک مصیبت بھی ایک وطنی قومیت کے مختلف عناصر میں اتحاد کا عام ولولہ اور حب وطن کا عام جوش صرف اسی صورت میں پیدا کرتی ہے جب قومیت کے تمام اجزا اپنے آپ کو وطن کے تمام ذہنی و مادی فوائد میں برابر کا شریک و سہیم سمجھتے ہوں۔ اگر یہ صورت نہ ہو اور اوپر ہم بیان کر چکے ہیں کہ اس صورت کا پیدا ہونا

صرف خاص حالات ہی میں ممکن ہے) تو جو اجزائے قومیت اپنے آپ کو مظلوم سمجھتے ہیں وہ اس مشترک مصیبت کو ایک مصیبت سمجھنے کے بجائے بعض حالات میں اس کو اپنے لیے رحمت سمجھتے ہیں اور ایسے مواقع پر ان کی ہمدردیاں اپنے وطنی ہم قوموں کے بجائے بیرونی حملہ آوروں ہی کے ساتھ ہوتی ہیں۔ بیرونی حملہ آور اگر زیرک ہوں تو وہ کسی ملک کے اس اندرونی اضطراب سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ چنانچہ پہلی جنگ عظیم کے موقع پر اتحادیوں نے جو یہ نعرہ لگایا تھا کہ یہ جنگ مظلوم و مقہور اقلیتوں کی آزادی کے لیے لڑی جارہی ہے اس نعرہ سے انہوں نے اپنے حریفوں کے مقابل میں بڑا فائدہ اٹھایا۔ اگرچہ اس سے فائدہ اٹھا چکنے کے بعد انہوں نے خود اس کی پوری بے حرمتی کی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ وطن کی اساس پر بنی ہوئی قومیت اپنے اصلی مدعا کے اعتبار سے تو بودی اور پھس پھسی ہوتی ہے البتہ فتنہ کا مظہر یا اسلامی اصطلاح میں منافقین کی پرورش کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ فراہم کرتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر قومیت کے تمام عناصر کو بالکل مساوی درجہ میں آسودہ اور مطمئن کیا جاسکے تو اس خرابی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ خرابی خود وطنی قومیت کی تعمیر ہی میں مضمر ہے اس وجہ سے اس کو دور کرنا بہت مشکل ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے مذکورہ عوامل پر تنقید

اب آئیے اسلام کی روشنی میں مذکورہ عوامل پر غور کیجیے کہ وہ ان کو کس حد تک اور کس حد تک قبول کرتا ہے۔

اسلام ان تمام عوامل قومیت کو نہ تو یک قلم رد کرتا ہے اور نہ ان کو پورا کا پورا قبول ہی کرتا ہے۔ ان عوامل میں سے جو عامل جس حد تک عقل اور فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے اس کو اس نے نہ صرف اختیار کرلیا ہے بلکہ اس کو جزوِ دین بنادیا ہے جس کو نہ صرف ماننا ضروری ہے بلکہ اس پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن جہاں کہیں عقل اور فطرت کے حدود سے ان میں کوئی انحراف یا تجاوز ہے اسلام نے واضح الفاظ میں اس کی نشان دہی کردی ہے کہ یہ انحراف یا تجاوز حدود اللہ سے تجاوز ہے اور اس سے معاشرہ اور قومیت میں فساد کو راہ ملتی ہے جس کا اثر بالآخر سارے نظام زندگی پر پڑتا ہے۔

اسلام میں نسل و نسب کا درجہ

اسلام نسل و نسب کے رابطہ کو ایک نہایت قوی رابطہ تسلیم کرتا ہے۔ اس کو خاندان اور معاشرہ کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ رشتۂ رحم کاٹنے کو ایک گناہِ عظیم اور فساد فی الارض کا سبب

بتاتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کو تنگ نظریوں اور تعصبات کے شر سے پاک رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل حقایق بھی سامنے رکھ دیتا ہے۔

ایک یہ کہ تمام انسان ایک ہی خدا کی مخلوق اور ایک ہی آدم وحوا کی اولاد ہیں اس وجہ سے حقوق اگرچہ الاقرب فالاقرب کے اصول پر قایم ہیں لیکن اپنے خاندان یا اپنی قوم وقبیلہ کو حق و باطل کا معیار نہیں بنا لینا چاہیے اور اس کے تعصب میں اندھے ہو کر انصاف اور سچائی کے بالاتر اصولوں سے منحرف نہیں ہو جانا چاہیے۔

دوسرا یہ کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تمیز اور زبان اور رنگ کی تفریق محض شناخت اور تعارف کے لیے ہے یہ نہ عزت اور شرافت کی کوئی کسوٹی ہے اور نہ خدا سے تقرب و توسل کی کوئی دلیل، خدا کی نظر میں درجہ اور مرتبہ صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے ڈرنے والے اور اس کی شریعت اور اس کے قانون کا احترام کرنے والے ہیں۔ اور یہی لوگ ایک اسلامی معاشرہ میں بھی حقیقی عزت و احترام کے مستحق ہیں۔

تیسرا یہ کہ اجتماعی و سیاسی زندگی کے لیے صرف وہی ضوابط صحیح ہیں جو انسانی فطرت کے مطابق خود انسانوں کے خالق نے بنائے ہیں نہ کہ وہ جو قومی و قبائلی عصبیت کے تحت خود انسانوں نے ایجاد کیے ہیں۔

مذکورہ بالا حقایق قرآن و حدیث میں مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے بیان ہوئے ہیں ہم چند آیتوں اور حدیثوں کے ترجمے یہاں درج کرتے ہیں:۔

"اے لوگو! اپنے اس خداوند سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی نفس سے پیدا کیا اور اسی سے اس کی بیوی کو بھی پیدا کیا۔ پھر ان دونوں سے بہت سے مرد اور بہت سی عورتیں پھیلائیں اور اس اللہ سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور رحمی رشتوں کا احترام کرو۔ اللہ تم پر نگہبان ہے۔" (سورۂ نساء آیت)

یہ آیت ان بنیادی اصولوں کو واضح کر رہی ہے جن پر اسلامی معاشرہ (یا بالفاظ دیگر اسلامی قومیت)

قائم ہے۔ اس میں دو چیزوں کو باہمی ہمدردی اور باہمی تعاون و تناصر کی بنیاد قرار دیا گیا ہے۔ ایک خدا کو، جو سب کا خالق ہے اور ایک رشتۂ رحم کو، جس کا شعور اگرچہ ایک خاص حد سے آگے جا کر مضمحل ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الحقیقت وہ تمام نسلِ انسانی کے درمیان مشترک ہے۔ علاوہ ازیں عورت کو بھی اس معاشرہ میں برابر کا شریک ٹھیرایا گیا ہے اگرچہ اپنے فرائض کے اعتبار سے اس کا دایرہ مردوں کے دایرے سے الگ ہے۔

دوسری آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو:۔

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک ہی مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور ہم نے تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں اس لیے تقسیم کیا ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے تعارف کا ذریعہ ہو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے زیادہ با عزت وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرنے والا ہے۔ اللہ علیم و خبیر رکھنے والا ہے"۔ (الحجرات، ۱۳)

حدیث میں رشتۂ رحم کی اہمیت ملاحظہ ہو:۔

"حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے خلق کو پیدا کیا، یہاں تک کہ جب ان کو پیدا کر کے فارغ ہوا تو رحم کھڑا ہوا اور اس نے عرشِ الٰہی کو تھام کر کہا کہ یہ جگہ ہے اُس کی جو قطع رحم سے تیری پناہ چاہے؟ ارشاد باری ہوا ہاں۔ کیا تو اس بات پر راضی نہیں ہے کہ میں اس سے جوڑوں جو تجھ سے جوڑے اور اس سے کاٹوں جو تجھ سے کاٹے؟ بولا، میں اس پر راضی ہوں۔ ارشاد باری ہوا کہ یہ مقام تجھ کو بخش گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو، (یعنی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہو جائے گی) فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ ۝[1] (ریاض الصالحین بحوالہ مسلم و بخاری)

[1] پس تم سے یہی متوقع ہے، اگر تم منہ موڑے رہو، کہ تم زمین میں فساد مچاؤ اور رشتہ رحم کو کاٹو۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کے کان بہرے کر دیے اور ان کی آنکھیں اندھی کر دیں۔ (محمد، ۲۲)

اس حدیث سے واضح ہوتا ہے کہ قطع رحم یا قطع قرابت اتنا بڑا جرم ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں قطع رحم کرنے والوں پر لعنت کر دیتا ہے اور ان کے دلوں دماغوں کو اندھا بہرا کر دیتا ہے۔

زبان و ادب کی حیثیت اسلام معاشرہ کی تشکیل میں زبان و ادب کے مرتبہ اور اس کی اجتماعی سیاسی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو بھی مجرد قومی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اخلاقی معیاروں پر جانچ کر اس کے سلیم و سقیم اور خبیث و طیب میں فرق کرتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ قومی زبان اور قومی ادب کے نام سے رطب و یابس اور پاک و ناپاک کا جو انبار بھی اکٹھا کر دیا جائے وہ سب کا سب بلا کسی فرق و امتیاز کے یکساں عزت و احترام کے لائق قرار دے دیا جائے۔ اور اس پودے کی حفاظت و صیانت اور اس سارے کی نقل و روایت ایک قومی فریضہ سمجھ لی جائے۔ حد یہ ہے کہ لاکھوں روپے دیہاتیوں کے گیتوں اور ان کے قصوں کہانیوں کے جمع کرنے، ان کو مرتب کرنے اور پھر ان کو لوگوں کے ذہنوں پر لادنے پر ضایع کر دیے جائیں۔ اسلام کا نقطۂ نظر اس معاملے میں جیسا کہ عرض کیا گیا بالکل عقلی و اخلاقی ہے۔ وہ صرف اسی ادب کو ادب قرار دیتا ہے جو صحیح منبع سے نکلا ہو اور جو ذہنوں کو صحیح غذا دینے والا اور طبیعتوں کو صحیح رُخ پر ڈالنے والا ہو۔ اگر محض ادبی اور قومی نقطۂ نگاہ سے اس معاملے کو دیکھا جائے تو حالی و اقبال کے ادب اور امانت لکھنوی اور زہرِ عشق کے مصنف کے ادب دونوں کے لیے احترام کے الگ الگ پہلو نکل سکتے ہیں لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو امانت اور شوق کے ادب کو ادب میں جگہ دینے کے بجائے عیب کی طرح چھپانا پڑے گا۔

امرء القیس کو عرب میں ایک قومی شاعر ہونے کے لحاظ سے اشعر الشعراء کا بلند مقام حاصل تھا لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں فرمایا کہ اشعر الشعراء وقائدھم الی النار کہ یہ تمام شاعروں کا امام اور ان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے۔ اگر حضورؐ بھی اس کو محض قومی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے تو اس کو اشعر الشعراء ہی قرار دیتے لیکن آپؐ کا نقطۂ نگاہ اخلاقی بھی تھا اس وجہ سے آپؐ نے ایک ایسے شاعر کے سارے ذخیرۂ ادبی کو رد کر دیا جس نے عرب کے قومی ادب کو اگرچہ سب سے قیمتی سرمایہ دیا تھا لیکن ساتھ ہی بے حیائی اور فحاشی میں بھی آپ اپنی مثال تھا۔ اس کے برعکس آپؐ نے دوسرے اسلامی

شاعروں کے کلام سنے اور ان کی تحسین فرمائی۔ زمانۂ جاہلیت کے بعض شاعروں اور خطیبوں کے کلام کی بھی آپؐ نے تعریف فرمائی۔ بعض خطیبوں کے متعلق تو یہ تک ارشاد ہوا کہ یہ حقیقت کے بہت قریب پہونچ گئے تھے لیکن حقیقت کو پا نہ سکے۔ حضرت عمرؓ مشہور جاہلی شاعر زہیر کے کلام کو بہت پسند کرتے تھے، اور وجہ یہی تھی کہ اس کے کلام میں امرء القیس کی سی رندی و ہوسناکی نہیں ہے بلکہ نہایت گہری حکمت کی باتیں ہوتی ہیں اور ایسی خوبی کے ساتھ کہتا ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہیں۔ یہ باتیں اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں قومیت کے ایک عامل کی حیثیت سے زبان و ادب کو ایک جگہ حاصل تو ہے لیکن صرف پاکیزہ ادب کو حاصل ہے، ہر ہرزہ سرائی کو اسلام یہ جگہ نہیں دیتا۔

تہذیب اور روایات اسلام قومیت کی تشکیل میں تہذیب اور روایات کی اہمیت کو بھی تسلیم کرتا ہے لیکن جس طرح وہ زبان و ادب کو اخلاقی کسوٹی پر جانچ کر اس کے صالح عنصر کو اپناتا اور فاسد کو رد کر دیتا ہے اسی طرح وہ قومی تہذیب کے مظاہر اور قومی روایات کو بھی اخلاق کی کسوٹی پر جانچتا ہے اور اس جانچ کے بعد ان کا جو حصہ مُنکر ثابت ہو جاتا ہے اس کو تو رد کر دیتا ہے اور جو معروف ہوتا ہے اس کو اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن کو پڑھیے تو آپ کے سامنے بار بار یہ بات آئے گی کہ فلاں بات معروف کے مطابق کرو۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس معاملے میں قومی دستور اسلام کی نظر میں پسندیدہ تھا جس کے سبب سے اسلام نے اس کی اس قدر عزت بڑھائی کہ اس کو خود اپنا ایک حصہ بنا لیا۔ برعکس اس کے قومی رسوم و عادات یا تہذیب اور روایات میں جو باتیں اخلاق کے اصول کے منافی یا حقیقت کے خلاف تھیں ان کو منکر قرار دے کر رد کر دیا۔ اسی طرح عرب کے تاریخی اشخاص میں سے لقمان اور ان کے فرزند کا نہایت اچھے انداز میں قرآن نے ذکر کیا ہے، بلکہ پوری قوم کے بوڑھوں اور نوجوانوں کے سامنے ان کو ایک لائق باپ اور ایک لائق فرزند کی مثال کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ ان کی حکیمانہ نصیحتوں کا رتبہ تو اتنا بڑھایا ہے کہ وحی الٰہی نے ان کو خود قرآن کا ایک حصہ بنا دیا ہے۔ یہ لقمان عرب کے حکماء میں سے صرف ایک حکیم تھے کوئی پیغمبر نہیں تھے۔ ان کے پیغمبر ہونے کا کوئی ثبوت کم از کم میرے علم میں نہیں ہے۔ اسی طرح قرآن نے ذوالقرنین کا ذکر ایک عادل اور خداترس حکمراں کی حیثیت سے کیا ہے حالانکہ وہ ایک غیر قوم سے تعلق رکھتا تھا۔ ان چیزوں سے ثابت

ہوتا ہے کہ اسلام تہذیب اور روایات کو متعصبانہ نگاہ سے دیکھنے کے بجائے حق پرستانہ نگاہ سے دیکھتا ہے، اس کا خود اپنا ایک معیار ہے جس پر جانچ کر وہ ایک چیز کو رد یا قبول کرتا ہے اور یہ معیار اخلاقی اور عقلی ہے۔ نہ کہ قومی۔ قومی نقطۂ نگاہ تو ان معاملات میں بسا اوقات اتنا متعصبانہ ہو جاتا ہے کہ اس تعصب کے اندھے فرعون کو محض اس دلیل پر اپنا لیڈر مان لیں گے کہ وہ ان کی اپنی قوم سے تھا اگرچہ وہ نہایت مستبد اور ظالم تھا اور اس کے ظلم و استبداد ہی کے سبب سے اس کی پوری قوم عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوئی۔ اور حضرت موسیٰ ع کو محض اس بنا پر رد کر دیں گے کہ وہ نسلاً دوسری قوم سے تعلق رکھتے تھے اگرچہ وہ عدل و انصاف کے پیکر تھے اور ان کے ہاتھوں مظلوموں کو نجات ملی۔

اسلام کی نظر میں وطن کی حیثیت اسلام وطن کو بھی بڑی اہمیت دیتا ہے۔ یہاں تک کہ کوئی مسلمان اگر اپنے وطن کی حفاظت کی راہ میں مارا جائے تو اس کی موت شہادت کی موت ہے لیکن وطن کی اس اہمیت کے باوجود اسلام نے وطن کو بھی حق کے اصولوں کے تابع ہی رکھا ہے، اس کو حق سے بالاتر نہیں قرار دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں انسان کی اصلی قدر و قیمت اس کے ایک عقلی و اخلاقی ہستی ہونے کی ہے نہ کہ کسی خاص رقبہ زمین کے باشندہ ہونے کی۔ اس وجہ سے وہ اس کے عقلی و اخلاقی مطالبات اور تقاضوں کو دوسرے تمام مطالبات اور علائق پر مقدم رکھتا ہے۔ اگر کسی مرحلے میں عقل اور اخلاق کے مطالبات اور وطن کے مطالبات میں تصادم واقع ہو جائے تو اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ آدمی عقل و اخلاق کے مطالبات کا ساتھ دے، وطن کے مطالبات کو نظر انداز کر دے۔ اگر ایک سرزمین پر آدمی اپنے اخلاقی و ایمانی تقاضوں کو پورا نہ کر سکتا ہو بلکہ وہ مجبور ہوتا ہو کہ وہ جس نظریہ حیات پر ایمان رکھتا ہے اس سے دست بردار ہو، جن اخلاقی ضوابط کا پابند ہے ان کو نظر انداز کرے اور جن حدود کی نگہداشت وہ اپنے فرائض میں سمجھتا ہے ان کو توڑے تو اس سرزمین کے ساتھ محض اس وجہ سے اس کا بندھے رہنا کہ وہاں سے اس کو پیٹ پالنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا میسر ہے اس کی انسانیت کی توہین ہے۔ ایک سچا مسلمان ایسی حالت میں دو ہی راہیں اختیار کر سکتا ہے یا تو اس کی اصلاح کے لیے اپنا پورا زور لگائے اور اس کو اس قابل بنائے کہ اپنے دین و ایمان کے ساتھ وہاں زندگی بسر کر سکے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو پھر دوسری راہ یہ ہے کہ وہ اپنے دین

ایمان کو لے کر وہاں سے کسی ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائے جہاں زندگی کے دوسرے عیش چاہے حاصل نہ ہوں لیکن دین و ایمان کی آزادی حاصل ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو عجب نہیں کہ وہ ایک مخالف ماحول میں ایمان کی نعمت ہی سے محروم ہو جائے ۔ قرآن مجید کی ایک آیت کا ترجمہ ملاحظہ ہو :۔

"جن لوگوں کو فرشتے اس حال میں موت دیتے ہیں کہ وہ (دار الکفر میں پڑے رہنے کے سبب سے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں۔ فرشتے ان سے پوچھتے ہیں تم کس حال میں پڑے رہے؟ وہ کہتے ہیں ہم اپنے وطن میں بے بس اور مقہور تھے۔ فرشتے ان سے کہتے ہیں کیا خدا کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ وہی لوگ ہیں کہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور برا ٹھکانا ہے۔" (۹۷، نساء)

مذہب اسلام مذہب کو قومیت کی تشکیل میں سب سے زیادہ مؤثر اور سب سے زیادہ قوی عامل مانتا ہے لیکن اگر مذہب کی بنیاد شرک پر ہو یا قومی تعصبات کے تحت اس میں حق و انصاف کے فطری اصولوں کو بالکل مسخ کر دیا گیا ہو، یا وہ حقیقی فرائض اور واقعی حقوق کی تعلیم دینے کے بجائے صرف عوام کی خواہشوں کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ہو تو ایسے مذہب کو اسلام نہ تو صحیح مذہب مانتا اور نہ اس طرح کے کسی مذہب پر قائم ہونے والی قومیت کو صحیح قومیت تسلیم کرتا ہے۔ اس طرح کے مذہب میں وہ سارے مفاسد موجود ہوتے ہیں جو نسل و نسب اور زبان اور رنگ سے بنی ہوئی قومیتوں کے اندر ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ دنیا کے مشرکانہ مذاہب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایجاد ہی اس لیے کیے گئے ہیں کہ وہ اپنے پیرووں کے قومی تعصبات اور ان کی قومی امنگوں کو اشیر باد دیں۔ یہودی مذہب اگرچہ اپنی اصل کے لحاظ سے مشرکانہ مذہب نہیں ہے بلکہ ایک آسمانی مذہب ہے لیکن بنی اسرائیل نے، جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں، اس میں طرح طرح کی تحریفات کر کے اس کو ایک خدائی مذہب کے بجائے اس کو اپنا ایک قومی مذہب بنا ڈالا۔ مذاہب کے اندر یہ فساد پیدا ہو جانے کے سبب سے اسلام ان میں سے کسی کو بھی اس لائق نہیں سمجھتا کہ وہ ایک صحیح المزاج قومیت کی بنیاد بن سکے۔

(باقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم

مخالفتوں کے طوفان سے گذرتے ہوئے

مدنی دور

نعیم صدیقی

مفسدانہ پروپگنڈے کا محاذ جمود پسند فاسد عناصر جب کسی دعوتِ اصلاح و تعمیر سے دوچار ہوتے ہیں تو پھر ہمہ تن اس کے علم برداروں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ خود تو کچھ کرنا نہیں ہوتا اور خدا و خلق کی طرف سے کسی طرح کی ذمہ داریاں تسلیم نہیں ہوتیں، اس لیے ساری ذہانتیں اور قوتیں بآسانی منفی مصرف میں لگا دی جاتی ہیں۔ یہ عناصر غول بن کر داعیانِ اصلاح و تعمیر کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں، دور بینیں اور خوردبینیں لگ جاتی ہیں اور پیمانے اور مسطر سنبھال لیے جاتے ہیں۔ ہر آن بات بات کا تجزیہ ہوتا ہے۔ ایک ایک واقعہ کا گہرا جایزہ لیا جاتا ہے، ہر ہر معاملے کی چیر پھاڑ ہوتی ہے۔ کوئی ٹیڑھ ادھر سے نکالی جاتی ہے، کوئی کجی اُدھر سے تلاش کی جاتی ہے اور پھر ڈونڈی پیٹ پیٹ کر اعلان کیا جاتا ہے کہ لوگو! دیکھو یہ گمراہی ہے، یہ فساد ہے، یہ کفر ہے، یہ اسلاف دشمنی ہے، یہ بزرگوں کی توہین ہے، یہ اکابر پر تنقید ہے۔ چنانچہ اندھی مخالفت کے نشے میں بہک کر جب کسی بھلے آدمی اور اس کے مفیدِ انسانیت کام کو نقصان پہونچانا مطلوب ہوتا ہے تو پھر ایک طرف ہر بھلی سے بھلی بات کے اندر سے کیڑے نکال کر دکھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف اس کام کے کرنے والوں سے ذرا سا بھی سہو ہو جائے تو بات کا بتنگڑ بنا کر رائے عام کا طوفان اٹھا دیا جاتا ہے۔

سب سے زیادہ زرّیں مواقع تخریبی عناصر کے لیے وہ ہوتے ہیں جب کوئی بات یا کوئی واقعہ عام لوگوں کے غلط توہمات اور معتقدات اور مسلّمہ رسمیات کے خلاف ہو جائے ـــــ خواہ وہ بجائے خود کتنا ہی برحق اور اقرب الی الصواب کیوں نہ ہو! یہ ظاہر ہے کہ اصلاحی، تعمیری اور انقلابی تحریکوں کو عوام کے بہت سارے مسلّمات کے بتوں کو توڑنا ہوتا ہے، اس لیے مخالفانہ پروپگنڈے کے لیے نت نئے موضوعات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ یہی صورت حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء کو یہود کی طرف سے درپیش تھی۔ صبح شام ایک نہ ایک واویلا مچتا رہتا اور ایک نہ ایک اشتہار بازی ہوتی رہتی۔

ہوسِ منصب کا الزام | کسی علم بردارِ حق کے دامنِ خلوص پر نفسانیت کے دھبّے ڈالنے کے لیے مخالفین نے ہر دور میں ایک الزام یہ رکھا ہے کہ یہ شخص کچھ بننا چاہتا ہے، کوئی منصب حاصل کرنے کے درپے ہے، اپنا کوئی مقام بنانا چاہتا ہے۔ حضرت موسٰی و ہارون علیہما السلام کے خلاف یہی پروپگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ اپنی حکومت جمانا چاہتے ہیں۔ حضرت عیسٰیؑ کے خلاف غوغا کیا گیا کہ یہ صاحب تو یہودیوں کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ اسی طرح وفدِ نجران کی آمد کے موقع پر سرورِ عالمؐ کے خلاف یہودیوں نے ایک پروپگنڈہ یہ بھی اٹھایا کہ یہ ساری جان ماریاں تو بس اس غرض سے ہیں کہ جو مقامِ عیسٰی علیہ السلام کا چلا آ رہا ہے وہ آپؐ کے قبضے میں آ جائے اور عیسائیوں اور دوسرے لوگوں کو آہستہ آہستہ گھیر کر اپنی پرستش میں لگا لیا جائے۔ غور فرمائیے، حضورؐ نے اس طرح کا کبھی کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا، ایسے منصب کی طلب کا اشارہ تک نہیں دیا تھا، لیکن مخالف طاقت نے خود ہی اپنے ذہن سے ایک طومار گھڑ لیا اور اپنی جگہ طے کر لیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد تو بس یہ کہ عیسٰی بن کر پوجا کرائیں۔ دعویٰ نہ کیا ہو تو نہ سہی، دل میں اسی کے ارادے ہیں۔ ابھی یہ ارادے سامنے نہیں آئے تو کیا ہوا، آثار بتا رہے ہیں کہ کبھی نہ کبھی یہ سامنے آ کر رہیں گے۔ وفدِ نجران کے ارکان کے کان ان فضولیات سے بھرے گئے ہوں گے، جبھی تو اس وفد کے ایک رکن ابو رافع قرظی نے یہ سوال حضورؐ سے کھلم کھلا دریافت کیا کہ "کیا آپ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی اس طرح پوجا کریں

جیسے نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی پوجا کرتے ہیں ؟"۔ وفد کے ایک دوسرے رکن الربّیس (یا الریس یا الرئیس) نے بھی پوچھا کہ: " اے محمدؐ! کیا آپ ہم سے یہی چاہتے ہیں اور اسی کے لیے دعوت دیتے ہیں ؟"۔ آپؐ نے جواب دیا: خدا کی پناہ ، اس بات سے کہ میں خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کروں یا اس کے سوا کسی اور کی بندگی کی دعوت دوں۔ پس مجھے خدا نے اس مقصد کے ساتھ نہیں اٹھایا ہے اور نہ مجھے اس کا حکم دیا ہے۔" [1] قرآن بھی اس موقع پر پکار اٹھا کہ "کسی انسان کا یہ منصب نہیں ہے، کہ خدا اسے کتاب اور حکمت اور نبوت سے سرفراز کرے تو پھر وہ لوگوں سے یہ کہنے لگے کہ اللہ کے بجائے میرے بندے بن جاؤ"۔

مسلّمہ مذہبی شعائر کی بے حرمتی کا الزام

قائدِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کر کے چلے آنے پر مکہ میں انتقامی جذبات نے نئی کروٹ لینی شروع کر دی تھی اور برابر جنگی کارروائی کے لیے سوچا جا رہا تھا۔ ان کے جاسوس مدینہ کے اطراف میں گھومتے تھے، ان کا سلسلۂ نامہ و پیام خفیہ طور پر یہودِ مدینہ کے ساتھ شروع ہو چکا تھا اور ان کے فوجی دستے وقتاً فوقتاً اسلامی ریاست کے حدودِ اثر تک پہونچنے لگے تھے۔ اس کے جواب میں اسلامی ریاست نے بھی اپنا نظامِ دیدبانی برسرِ عمل کر دیا۔ فوجی اور غیر فوجی پارٹیاں گشت کے لیے نکلتیں اور قریش کے جاسوسوں اور فوجی دستوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتی رہتیں۔ مدینہ اپنی اس نقل و حرکت سے قریش کو ایک طرف یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم سوئے نہیں پڑے ہیں اور ساتھ ہی یہ اندیشہ دلانا بھی مقصود تھا کہ اگر تم نے امن کی فضا کو خراب کر دیا تو پھر تمہارے تجارتی قافلوں پر یہ شاہراہ بند ہو جائے گی۔

اسی نظامِ دیدبانی کے تحت رجب سنہ ۲ھ میں آٹھ آدمیوں کا ایک دستہ قریش کی نقل و حرکت اور ان کے آئندہ منصوبوں کا جائزہ لینے کے لیے قائدِ انسانیتؐ نے روانہ فرمایا۔ اس دستہ کو کسی جنگی کارروائی کا مجاز نہیں ٹھیرایا گیا تھا۔ لیکن ان کی مڈبھیڑ قریش کے ایک چھوٹے سے تجارتی قافلے سے ہوئی تو اس عالمِ تقابل میں باہمی ذہنی کھچاؤ ایسے نقطہ تک جا پہونچا کہ اسلامی ریاست کے دستے نے حملہ کر کے ایک

---

[1] سیرابن ہشام ج ۲ صفحہ ۲۰۲

آدمی کو قتل کر دیا، بقیہ کو گرفتار کر کے مال و اسباب سمیت مدینہ لے آئے۔ یہ واقعہ چونکہ رجب کے خاتمے اور شعبان کے آغاز کے دوران میں کسی وقت ہوا تھا اس لیے اشتباہ و التباس کے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ایک طرف مکہ کے مشرکین نے اور دوسری طرف مدینہ کے یہود و منافقین نے پروپگنڈہ کا طوفان کھڑا کر دیا۔ انہوں نے اس واقعہ کو قطعی طور پر شعبان سے متعلق کر کے عوام کو اشتعال دلانے میں پورے زور سے کام لیا۔ وہ کہتے پھرتے تھے کہ "یہ لوگ چلے ہیں بڑے اللہ والے بن کر اور حال یہ ہے کہ ماہِ حرام تک میں خوں ریزی سے نہیں چوکتے"۔[۵] اس پروپگنڈہ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں بہت ہی نقصان دہ تھا۔ یہ مختصر سی نوخیز طاقت جو چار طرف سے دشمنوں اور خطروں میں گھری تھی اور جس کے لیے کسی بھی فرد اور کسی بھی عنصر کی حمایت بڑی قیمتی تھی، اس کے بارے میں عرب میں اس تاثر کا پھیل جانا کہ وہ حرام مہینوں کا احترام ختم کیے دے رہی ہے درانحالیکہ اس حرمت پر ہی عرب کے دینی اور معاشی نظام کا دار و مدار تھا ــــــ اس کے حامیوں کو اس سے کاٹ کر اس کے مخالفوں میں دھکیل دینے والا تھا۔ پھر چونکہ اس معاملے کا تعلق عوام کے نازک مذہبی جذبات سے تھا، اس لیے یہ وجہ اشتعال بھی تھا۔ خصوصیت سے یہ پروپگنڈہ مسلمانوں کی خدا پرستی اور دینداری اور اخلاقی لحاظ سے ان کے ذمہ دارانہ پن پر ایک کاری ضرب کی حیثیت رکھتا تھا۔

نخلہ کا یہ ایک حادثہ ایک اور وجہ سے خود اسلامی ریاست کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پایا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دستے کو کسی طرح کے تصادم کا اختیار نہیں دیا تھا۔ بغیر باضابطہ اختیار کے اس دستے نے ایک ایسا قدم اٹھا دیا جو اسلامی ریاست کے اُس پورے منصوبے کو متاثر کرنے والا تھا جو حفاظت اور دیدبانی کی غرض سے پیشِ نظر تھا اور جس کے مطابق بڑی احتیاط سے ہر کارروائی کی جا رہی تھی۔ اب چونکہ نخلہ کا حادثہ سرے سے ایک بے ضابطہ اور غیر قانونی کارروائی تھی، لہٰذا آں حضورؐ نے متعلقہ افراد سے سختی سے باز پرس کی اور ان کی تادیب کی اور گرفتار شدہ جنگی قیدیوں کو قبول کرنے اور ان کے اموال کو بیت المال میں لینے سے انکار کر دیا۔

---

[۵] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۶۵

اسلامی ریاست نے اپنے نظم کے تحت اس بے ضابطہ کارروائی پر جو کارروائی مناسب تھی وہ تو اپنی جگہ کر دی، لیکن مخالفین نے مفسدانہ پروپگنڈے کا جو طوفان اٹھا دیا تھا اس کا مقابلہ زیادہ مضبوط اور مدلل اور اخلاقی اثر رکھنے والے صاف ستھرے پروپگنڈے سے کیا۔ خود اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس کا جواب سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان الفاظ میں دلوایا کہ :۔

"لوگ پوچھتے ہیں کہ ماہِ حرام میں لڑنا کیسا ہے ! اے پیغمبر کہیے کہ اس میں لڑنا بہت برا ہے ، مگر راہِ خدا سے لوگوں کو روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام کا راستہ خدا پرستوں پر بند کرنا اور حرم کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا ہے ! ـــــ اور فتنہ خونریزی سے شدید تر ہے!" (البقرہ ـــ ۲۱۷)

صاف معلوم ہوتا ہے کہ تحریک کے مخالفین کے اس طوفانی پروپگنڈے سے جو اسلامی جماعت کے ارکان متاثر ہوئے اور پریشانی میں مبتلا ہو ہو کر انہوں نے سوالات کیے کہ ماہِ حرام میں جنگی کارروائی کرنا اسلامی نظریہ و قانون کی روشنی میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ جن لوگوں پر نیکی اور صلح پسندی کا ایک غیر متوازن تصور زیادہ پرتو افگن تھا اور جو ذرا ذرا سی مخالفت سے گھبرا اٹھتے تھے ، ان کو خاص طور پر تشویش ہونے لگی تھی کہ کہیں ہم روح دین اور جوہرِ تقویٰ کو ہاتھ سے دیتے تو نہیں جا رہے اور کہیں ہم سیاست زدہ ذہن کے تحت اپنے اصل مقصد سے دور جا کر عام لوگوں کو خود ہی تو دور نہیں دھکیلتے جا رہے سو اس طرح کے افراد کی پریشانی غیر معمولی نوعیت رکھتی تھی۔ ان کا دلی اطمینان متزلزل ہو چلا تھا۔ لہٰذا وہ خصوصیت سے اس معاملے میں اطمینان حاصل کرنا چاہتے تھے۔ سوالات کے پیچھے یہ ذہن خاص طور پر متحرک تھا۔ اس کو سامنے رکھتے ہوئے دشمنانِ تحریک کو بھرپور جواب دیا گیا۔ فرمایا کہ مشرکینِ مکہ جو خود تو راہِ خدا سے روکنے اور اللہ سے کفر کرنے اور زائرینِ حرم کا راستہ روکنے اور باشندگانِ حرم کو حدودِ حرم سے تنگ کر کر کے نکالنے کے مجرم ہیں ، اب وہ ماہِ حرام کی حرمت کے محافظ بن کر کس منہ سے میدان میں آ رہے ہیں۔ اس میں یہود اور منافقین کے لیے یہ خطاب مضمر تھا کہ تم جو اہل مکہ کے ان سارے مظالم اور دینی شعائر کی حرمتوں کو توڑ دینے والی کارروائیوں پر منہ میں گھنگنیاں ڈالے پڑے رہے ہو

اور آج بھی تم کو اس بارے میں کچھ احساس نہیں ہے ، واقعہ نخلہ کے سلسلے میں مسلمانوں کی ایک ایسی اتفاقی کارروائی پر کاہے کو نگہدارِ شعائر بن کر اٹھ کھڑے ہوئے ہو جس کے لیے نظامِ ریاست کی طرف سے باقاعدہ اجازت نہیں دی گئی بلکہ چند افراد کی نادانی سے ایک اقدام ہوگیا، چنانچہ اس کے نتائج کو قبول کرنے سے ریاست کے سربراہ نے انکار کر دیا اور متعلقہ افراد کو سخت تادیب بھی کر دی۔

اس واقعہ کے تاریخی آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے کہ اہلِ حق کے دشمن کس طرح گھات لگائے بیٹھے رہتے ہیں کہ کہیں سے ان کو کوئی رخنہ ملے اور وہ اس سے حملہ کر دیں اور کہیں کوئی سہو اور بے احتیاطی کا کام کرنے والوں سے سرزد ہو اور وہ فوراً اس کو دنیا بھر میں اپنی حاشیہ آرائیوں کے ساتھ اُچھال دیں۔

جہاں ہر ہر لمحہ ہر ہر معاملے میں اس طرح غلط فہمیوں اور بدگمانیوں اور اشتعال انگیزیوں کے طوفان اٹھائے جاتے ہوں گے ، وہاں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دشمنوں میں گھری ہوئی ننھی سی ریاست اور اس کو وجود میں لانے والی انقلابی تحریک اور اس تحریکِ فلاحِ انسانیت کے قائد پر کیا گذرتی ہوگی۔ شکوک و شبہات ، شرپسندانہ اعتراضات اور کارکنوں کو ذہنی طور پر الجھا دینے والے سوالات فضا میں بھنگوں کی طرح اڑتے پھرتے ہوں گے اور زمین پر برسات کے کیڑوں کی طرح ہر طرف رینگتے دکھائی دیتے ہوں گے۔ لیکن بھنگوں اور کیڑوں کی نقل و حرکت نے کبھی کسی اصول و کردار رکھنے والی طاقت کے فاتحانہ اقدام کو روکنے میں کامیابی نہیں حاصل کی۔

دین کے پردے میں نفسانیت کا الزام

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ اسلام کی نافذ کردہ اصلاحات میں سے ایک ایک پر یہودی مولویوں اور مفتیوں نے نامعقول قسم کے ہنگامے بپا کیے تھے۔ بہت بڑی اصلاح منہ بولے بیٹوں کے مقام اور حقوق کے سلسلے میں نافذ کی گئی۔ چنانچہ اس پر مخالفانہ پروپگنڈے کا ہنگامہ بھی زور شور کے ساتھ اٹھایا گیا۔

ایک اہم تاریخی روایت سابق مذہبی و معاشرتی تصورات کے مطابق یہ چلی آرہی تھی کہ متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) کی مطلقہ سے حقیقی بہو کی طرح نکاح کرنا ناجائز ہے۔ اس روایت کو ختم کرنے کے لیے مشیتِ الٰہی نے

واقعات کو بڑی عجیب و غریب صورت سے نشو و نما دی اور پھر ایک انقلابی نتیجے تک پہنچایا۔ ہوا یہ کہ زیدؓ جو دس برس کی عمر میں غلام بن کر بکے تھے اور جن کو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید کر اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا تھا، وہ حضورؐ کے گھر میں متبنّٰی کی حیثیت رکھتے تھے۔ بعد میں زید کے باپ اور بھائی ان کو لینے آئے اور حضورؐ نے اذن بھی دیا کہ چاہو تو جا سکتے ہو لیکن زید کو آپؐ سے اب اتنی گہری محبت ہو چکی تھی کہ اس رشتے کا ٹوٹنا گوارا نہ ہوا۔ زید چونکہ اصلاً اشرافِ عرب میں سے تھے، اس لیے مکہ کے کچھ بزرگوں نے جناب زینبؓ (حضورؐ کی پھوپھی زاد تھیں) کو ان کے نکاح میں دینا تجویز کیا لیکن زینب کے بھائی اس پر راضی نہ ہوئے، کیونکہ نکاح کے لیے جو معیار اور پیمانے اس ماحول میں رائج تھے ان پر یہ جوڑ پورا نہیں اترتا تھا۔ جاہلی ذہن کی نگاہ میں حضرت زیدؓ کے دامنِ حیات پر گویا غلامی کے دھبے کا اثر بھی باقی تھا اور پھر ان کی بے سروسامانی بجائے خود ایک نقص تھی۔ اسلام آیا تو اس نے اس ذہن کو بھی بدلنا ضروری سمجھا اور محسنِ انسانیت نے خاندانی امتیازات کی رکاوٹیں نکاح و ازدواج کے راستے سے ہٹا کر پورے اسلامی معاشرے کو ایک خاندان میں بدل دینے کی کوشش فرمائی۔ چنانچہ فی الواقع یہ دیواریں قطعی طور پر ڈھے گئیں اور "کفو" کا ایک نیا مفہوم پیدا ہو گیا۔ آپؐ نے بڑی تاکید سے لوگوں کا ذوقِ نگاہ بدلا اور ان کو سکھایا کہ عورتوں کو نکاح میں لینے کے لیے مرتبۂ اول پر ان کے دین اور ان کے کردار کو دیکھو، باقی چیزوں کا لحاظ بعد میں ہے۔ ایک موقع پر تو یہ بھی فرمایا کہ اگر دین و کردار کے بجائے کوئی دوسرا معیار اختیار کرو گے تو معاشرت میں بڑا فساد واقع ہو جائے گا۔ اس طرح "کفو" کا نیا تصور یہ بنا کہ ازدواجی جوڑا اس لحاظ سے بننا چاہیے کہ اصل مقصدِ زندگی میں کون بہترین ساتھی بن سکتا ہے اور کس کے ساتھ ذہنی اور ذوقی سازگاری زیادہ سے زیادہ ممکن ہے۔ اور بے شمار بلکہ اکثر شادیاں اسی نئے رجحان کے مطابق عملاً ہونے لگیں۔ اس ذہنی و معاشرتی تبدیلی کا اندازہ اس واقعہ سے کیجیے کہ حضرت ابوطلحہؓ نے زمانۂ کفر میں حضرت ام سلیمؓ کو نکاح کا پیغام بھیجا، درآں حالیکہ موصوفہ اسلام لا چکی تھیں۔ انہوں نے جواب میں کہلایا کہ تم ٹھیرے کافر اور میں ہوں کہ اسلام لا چکی ہوں، اب دو متضاد زندگیاں کیسے جمع ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر اسلام قبول کر لو تو میں تم سے بجز قبولِ اسلام کے اور کوئی مہر بھی نہ لوں گی۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ رشتہ خود ام سلیم رضؓ کو بھی مرغوب تھا، لیکن اسلام نے ایسا انقلابی رجحان پیدا کر دیا تھا کہ انہوں نے دل پر پتھر رکھ کر انکار کر دیا مگر ساتھ ہی ترغیب اسلام بھی دلادی۔ آخر ابو طلحہ رضؓ اسلام لے آئے۔ نکاح ہوا اور فی الواقع ان کا اسلام ہی مہر قرار پایا۔ (موطائے امام مالکؒ[۵]) غرضکہ معاملہ ازدواج میں ذوق اور معیار کی تبدیلیاں آرہی تھیں۔ پھر بھی کچھ رکاوٹیں باقی تھیں۔ انہی کے سبب حضرت زینب رضؓ کے بھائی مجوزہ نکاح پر تیار نہ ہوئے۔ حضورؐ بھی چاہتے تھے کہ یہ نکاح ہو۔ لیکن جب اس میں مجرد ایک جاہلی رجحان رکاوٹ بنا تو یہ چیز خدا و رسول کی نگاہ میں ناپسندیدہ قرار پائی۔ اس سلسلے میں اشارۃً سورۂ احزاب میں گرفت کی گئی۔ ملاحظہ ہو آیت اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ .... اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (آیت ۳۵)

اس آیت کی اصل سپرٹ یہ ہے کہ اسلامی نظریہ اور اسلامی ذہن اور اسلامی کیریکٹر رکھنے والے مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں ہم سر اور ہم دوش ہیں اور ان میں قرابت و مودت ہے، یہ ایک دوسرے کے لیے قابل قدر ہیں، بجائے کہ ان کے بیچ میں خاندانی امتیازات اور فضل و شرف کے جاہلی تصورات آکے حائل ہوں۔ مگر اشارہ بس اتنا ہی نہیں تھا۔ اگلی آیت بڑی سخت تھی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملے کو کسی شکل میں طے کر دیں تو پھر کسی ایماندار مرد اور کسی ایمان دار عورت کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ پھر اس فیصلے کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند اور اپنے معیارات کو کوئی اہمیت دیں۔ اس طرح سے جو لوگ خدا و رسول کی نافرمانی کرتے ہیں تو وہ بہت دور تک بھٹک گئے۔ (احزاب۔ ۳۶) مطلب یہ تھا کہ جب ایک مسلم اور مسلمہ کے درمیان رشتۂ ازدواج کے قیام کے لیے دروازے کھول دیے گئے ہیں تو اب اپنے راستے میں پرانے جاہلی تصورات کو اہمیت دے دے کر حائل کرنا خدا اور رسول کی رہ نمائی اور ان کے فیصلوں کے مقابلے میں ایک طرح کی خودسری ہے اور ایسی خودسری گمراہی پر منتج ہوتی ہے۔ چوٹ بڑی سخت تھی اور ٹھیک نشانے پر لگی۔ زینب رضؓ کے بھائی ان آیات کو سن کر اشاروں میں بات پا گئے اور نکاح کے لیے تیار ہو گئے۔ گویا شرف و ذلت کے جاہلی معیار کی ایک زنجیر ٹوٹ گئی۔

---

[۵] ملاحظہ ہو اسوۂ صحابیات از مولانا عبدالسلام ندوی ص۲۱۸

(بقیہ اشارات)

گیا ہے تو کیا پھر بھی یہ غیبت ہو گی؟ فرمایا: ان کان فیه ما تقول فقد اغتبته وان لم یکن فیه ما تقول فقد بهته "اگر اس میں وہ برائی ہے اور تو نے بیان کی تو غیبت کی، اور اگر اس میں وہ نہیں ہے تو غیبت سے بڑھ کر تو نے بہتان لگایا"۔ قرآن اس فعل کو حرام قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۂ حجرات میں ارشاد ہے وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ "اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم خود نفرت کرو گے"۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کل المسلم علی المسلم حرام دمه وعرضه وماله "ہر مسلمان کی جان و مال اور عزت دوسرے مسلمان پر حرام ہے"۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ صورتیں ہیں جن میں کسی کی برائی کرنے کی جائز ضرورت ہو اور اس میں بدخواہی کی نیت شامل نہ ہو۔ مثلاً کسی مظلوم کا ظالم کی شکایت اس لئے کرنا کہ کوئی اس کی فریاد رسی کرے۔ اس کی اجازت خود قرآن میں دی گئی ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ "اللہ برائی پر زبان کھولنا پسند نہیں کرتا الا یہ کہ کسی شخص پر ظلم ہوا ہو"۔ یا مثلاً ایک شخص دوسرے شخص سے بیٹی بیاہ رہا ہو یا اس سے کوئی کاروباری معاملہ طے کر رہا ہو اور فریقین میں سے کوئی اس معاملہ میں کسی جاننے والے سے مشورہ لے۔ اس صورت میں جو واقعی برائی آدمی کے علم میں ہو اُسے خیرخواہی کی بنا پر بیان کر دینا نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر برائی بیان کی ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ دو صاحبوں نے فاطمہ بنت قیس کو نکاح کا پیغام دیا۔ انہوں نے حضور سے مشورہ طلب کیا۔ آپ نے انہیں خبردار کیا کہ ان میں سے ایک صاحب کنگال ہیں، اور دوسرے صاحب بیویوں کو پیٹنے کے عادی ہیں۔ اسی طرح شریعت کو غیر معتبر راویوں کی روایات سے محفوظ کرنے کیلئے ان کے عیوب بیان کرنا تمام علماء امت نے بالاتفاق جائز رکھا اور ائمہ حدیث نے عملاً اس خدمت کو انجام دیا، کیونکہ دین کیلئے اسکی ضرورت تھی۔ خلقِ خدا پر علانیہ ظلم کرنے والوں اور فسق و فجور پھیلانے والوں اور کھلے کھلے بدکرداروں کی مذمت کرنا بھی جائز ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے عمل سے اس کا جواز ثابت ہے۔ اس طرح مستثنیٰ صورتوں کے ماسوا غیبت ہر حال میں حرام ہے اور اس کا سننا بھی گناہ ہے۔ سننے والوں پر لازم ہے کہ یا تو غیبت کرنے والے کو روکیں، یا اس شخص کی مدافعت کریں جس کی غیبت کی جا رہی ہو۔ یا بدرجۂ آخر اس محفل سے اٹھ جائیں جہاں ان کے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھایا جا رہا ہو۔

غیبت سے جو آگ لگتی ہے اسے پھیلانے کی خدمت چغلخوری انجام دیتی ہے اور اس میں بھی اصل محرک وہی نفسانیت کا جذبہ ہوتا ہے چغل خور کسی کا خیر خواہ بھی نہیں ہوتا نہ اس کا جس کی برائی کی گئی ہو اور نہ اس کا جس نے برائی کی ہو وہ دوست دونوں کا بنتا ہے مگر دراصل دونوں کا بدخواہ ہوتا ہے اسی لئے ایک کی بات کان لگا کر سنتا ہے اور اس کی تردید نہیں کرتا پھر دوست کو اسکی خبر پہنچاتا ہے تاکہ جو آگ اب تک ایک جگہ لگی ہوئی تھی وہ دوسری جگہ بھی لگ جائے۔ شریعت الٰہی میں اس چیز کو بھی حرام کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ فساد انگیزی میں غیبت سے بھی بڑھ کر ہے قرآن مجید میں جن اوصاف کو آدمی کی بدترین صفات میں شمار کیا گیا ہے ان میں سے ایک چغلخوری کرتے پھرنا بھی ہے (مشّاء بنمیم) حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لا یدخل الجنۃ نمام۔ کوئی چغل خور جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ حضور نے فرمایا تجدون شر الناس ذا الوجھین الذی یاتی ھؤلاء بوجہ وھؤلاء بوجہ۔ تم بدترین انسان اس شخص کو پاؤ گے جس کے دو منہ ہیں کچھ لوگوں کے پاس ایک منہ لے کر آتا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں کے پاس دوسرا منہ لے کر جاتا ہے۔ صحیح اسلامی رویہ یہ ہے کہ آدمی جہاں کسی کی غیبت سنے وہیں یا تو اس کی تردید کرے یا پھر فریقین کی موجودگی میں اس معاملہ کو چھیڑ کر اس کی صفائی ایسے طریقے سے کرائے جن سے ایک فریق کو یہ شبہ نہ ہو کہ دوسرے فریق نے اس کی غیر موجودگی میں اس کی برائی کی تھی۔ اور اگر غیبت کسی ایسی برائی پر ہو جو واقعی شخص مذکور میں پائی جاتی ہو تو ایک طرف غیبت کرنے والے کو اس کے گناہ پر متنبہ کرے اور دوسری طرف اس شخص کو بھی اپنی اصلاح کے لئے توجہ دلائے جس کی برائی بیان کی گئی تھی۔

اس سلسلہ فساد کی انتہائی کڑی نجویٰ ہے یعنی کھسر پھسر، سرگوشیاں اور خفیہ مشورے، جن سے بالآخر سازشوں اور جتھہ بندیوں تک نوبت پہنچتی ہے اور ایک

دوسرے کے خلاف کشمکش کرنے والے دھڑے وجود میں آتے ہیں۔ شریعت الٰہی اس کو بھی سختی کے ساتھ منع کرتی ہے قرآن مجید میں اس کو ایک شیطانی حرکت قرار دیا گیا ہے (اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ) اور اس کے بارے میں یہ اصول ہدایت دی گئی ہے کہ اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى۔ یعنی دو یا چند آدمیوں کی علیحدگی میں گفتگو کرنا اگر نیک مقاصد کے لئے اور تقوےٰ کے حدود میں ہو تو اس نجویٰ کی تعریف میں نہیں آتا جو ممنوع ہے البتہ وہ گفتگو ضرور نجویٰ اور ممنوع نجوے ہے جو جماعت سے آنکھ بچا کر اخفا کے اہتمام کے ساتھ اس غرض کے لئے کی جائے کہ کسی برے کام کی اسکیم بنانی ہے یا کسی دوسرے شخص یا گروہ کے خلاف کوئی کارروائی کرنی ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین کی خلاف ورزی کا ارتکاب کرنا ہے ایماندارانہ اور مخلصانہ اختلافات کبھی نجوے کے متحرک نہیں ہو سکتے۔ ان کی بات چیت کھلم کھلا ہوتی ہے بر سر عام جماعت کے سامنے ہوتی ہے۔ دلیل کے ساتھ قائل کرنے یا قائل ہونے کے لئے ہوتی ہے اور اس بات چیت سے اگر اختلافات باقی بھی رہ جاتے ہیں تو وہ کبھی موجب فساد نہیں ہوتے جماعت سے الگ ہٹ کر اخفا کے اہتمام کے ساتھ سرگوشیاں کرنے کی ضرورت صرف انہی اختلافات میں پیش آتی ہے جو اگر بالکل نفسانیت پر مبنی نہ بھی ہوں تو کم از کم ان میں نفسانیت کی آمیزش ضرور ہوتی ہے۔ ایسی سرگوشیاں کبھی نیک نتیجہ پیدا نہیں کرتیں انکی ابتدا چاہے کتنی ہی معصوم ہو رفتہ رفتہ وہ پوری جماعت کو آپس کی بدگمانیوں۔ تفرقوں اور دھڑے بندیوں کی چھوت لگا دیتی ہیں باہم بحث و بزکر کے جب چند آدمی ایک جتھے کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں تو پھر دوسرے لوگوں میں بھی ایسی ہی بحث و بزکرنے اور جتھے بنانے کا رجحان پیدا ہو جاتا ہے اور یہیں سے اس بگاڑ کی ابتدا ہوتی ہے جو بہترین اہل خیر کی جماعتوں کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر کے باہم دست و گریباں کر دیتا ہے۔

آخری مرحلہ وہ ہے جبکہ یہ بگاڑ عملاً رونما ہو جائے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو بار بار متنبہ کیا ہے۔ شدت کے ساتھ ڈرایا ہے۔ اور سختی کے ساتھ بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے فرمایا ان الشیطان قد یئس ان یعبدہ المصلون فی جزیرۃ العرب ولکن فی التحریش بینہم۔ شیطان اب اس بات سے تو مایوس ہو چکا ہے۔ کہ عرب میں جو لوگ نماز پڑھنے لگے ہیں وہ پھر اس کی عبادت کرنے لگیں گے۔ اب اس کی ساری امیدیں صرف ان کے اندر بگاڑ پیدا کرنے اور ان کو باہم لڑانے ہی سے وابستہ رہ گئی ہیں۔ حتیٰ کہ آپ نے یہاں تک فرمایا کہ لا ترجعوا بعدی کفارا یضرب بعضکم رقاب بعض "میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ اس طرح کی حالت پیدا ہو جانے کی صورت میں اہل ایمان کو جو طریقہ سکھایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اول تو آدمی خود فتنے میں حصہ لینے سے بچے۔ ان السعید لمن جنب الفتن " خوش قسمت وہ ہے جو فتنوں سے بچ گیا اور جو جتنا بھی اس سے دور ہے اتنا ہی زیادہ بہتر ہے۔ النائم فیہا خیر من الیقظان والیقظان فیہا خیر من القائم، والقائم فیہا خیر من الساعی " اس حالت میں سونے والا جاگنے والے سے بہتر ہے۔ اور جاگنے والا کھڑے ہونے سے بہتر ہے۔ اور کھڑا ہوا دوڑنے والے سے بہتر ہے"۔ دوسرے اگر وہ حصہ لے تو دینے والوں سے ایک فریق بن کر نہیں بلکہ صدق دل سے اصلاح کی کوشش کرنے والا بن کر لے جس کے متعلق صاف صاف ہدایات سورۂ حجرات کے پہلے رکوع میں دی گئی ہیں۔

نفسانیت کی اس حقیقت اور اس کے نشو و نما اور ظہور کے ان مراتب اور ہر مرتبے کے متعلق شریعت الٰہی کے ان احکام کو ذہن نشین کر لینا ان تمام لوگوں کیلئے ضروری ہے جو خیر و صلاح کی خدمت کرنے کیلئے مجتمع ہوں۔ ان میں سے ہر شخص کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ وہ اپنے آپ کو خود پسندی کے مرض سے بچائے۔ اور ان اخلاقی و روحانی نقصانات کو سمجھے جو اس مرض میں مبتلا ہونے سے پہنچتے ہیں

ان کی جماعت کو بھی بحیثیت مجموعی اس معاملہ میں چوکنا رہنا چاہیئے کہ کہیں اس کے اندر نفسانیت کے جراثیم کو انڈے بچے دینے کا موقع نہ مل جائے۔ انہیں اپنے دائرے میں کسی ایسے شخص کی ہمت افزائی نہ کرنی چاہیئے جو اپنے اوپر تنقید سن کر بپھر جائے اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے استکبار برتے۔ انہیں ہر اس شخص کو دبانا چاہیئے جس کی باتوں سے بغض و حسد کی بو آئے یا جس کا طرزِ عمل یہ بتا رہا ہو کہ وہ کسی شخص سے ذاتی کد رکھتا ہے۔ انہیں ایسے لوگوں کی بھی خبر لینی چاہیئے جو دوسروں کے معاملہ میں بدگمانی سے کام لیں، یا دوسروں کے حالات کی ٹوہ لگا کر ان کے عیوب تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں اپنی سوسائٹی میں غیبت اور نمامی کا بھی انسداد کرنا چاہیئے اور جہاں کہیں یہ بلا اپنا سر نکالے وہاں فوراً وہ سیدھا سیدھا اسلامی رویہ اختیار کرنا چاہیئے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔ انہیں خصوصیت کے ساتھ نجویٰ کے خطرات سے ہوشیار رہنا چاہیئے، کیونکہ یہ جماعت میں تفرقے کی تمہید ہے۔ کسی مخلص آدمی کو اس بات کے لئے ہرگز راضی نہ ہونا چاہیئے کہ کوئی شخص سرگوشی کر کے کسی اختلافی مسئلے میں اسے اپنا ساتھی بنائے، اور جس وقت بھی اس امر کی ابتدائی علامات ظاہر ہوں کہ کچھ لوگ جماعت میں یہ طریقہ اختیار کر رہے ہیں اسی وقت جماعت کو ان کی اصلاح، یا پھر ان کی سرکوبی کے لئے تیار ہو جانا چاہیے۔ ان ساری کوششوں کے باوجود اگر جماعت کے اندر کسی جتھہ بندی کا فتنہ رونما ہو ہی جائے تو پھر مخلصین کا یہ کام نہیں ہے کہ خود بھی کونوں اور گوشوں میں خفیہ سرگوشیاں کر کے کوئی دوسرا جتھا بنانے کے لئے ساز باز شروع کر دیں، بلکہ انہیں اس فتنے سے اپنا دامن بچا کر اس کو روکنے کے لئے انفرادی تدبیریں کرنی چاہئیں، اور ان میں ناکام ہونے کے بعد جماعت کے سامنے کھلم کھلا اس معاملے کو لے آنا چاہیئے۔ جس جماعت میں مخلص افراد کی کثرت ہوگی وہ اس طرح کے فتنوں سے خبردار ہو کر فوراً ہی ان کا استیصال کر دیگی، اور جس میں فتنہ پسند یا بے فکر افراد زیادہ ہوں گے وہ انہی فتنوں کی شکار ہو کر رہ جائے گی۔

خالی صفحه

Our English Literature

1. **Towards understanding Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This book is a first approach to a systematic and logical understanding of Islam and a good helper to its more extensive study.
PP. 231-Price Rs. 3/8

2. **Nationalism & India**—By Sayyed Abulala Maudoodi—This treatise deals with Nationalism and its bearing on Islamic way of thought and life, and our present social and political problems.
PP. 72-Price As. 12

3. **Political Theory of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—Basic theory of State in Islam and some of its important features are brought out in this pamphlet.
PP. 64-Price As. 12

4. **Process of Islamic Revolution**—This pamphlet explains how movement of Islam transforms its followers individually and collectively and how a true Islamic State necessarily follows. PP. 56-Price As. 14

5. **Economic Problem of man & Its Islamic Solution**—By Sayyed Abulala Maudoodi
PP. 55-Price As. 12

6. **The Ethical View-Point of Islam**—By Sayyed Abulala Maudoodi—The original was delivered as a lecture in Islamia College, Peshawar on 26th February, 1944
PP. 56-Price As. 12

7. **What is Islam?**—By Mohammad Mazhar-ud-Din Siddiqi PP. 96-Price Re. 1/8

8. **After Secularism what ?**—By Mohammad Mazahr-ud-Din—The aim of this brochure is to present the true conception of God and its practical requirements. PP. 56-Price As. 12

9. **Maudoodi on Islamic Law and Constitution**—
Price Rs. 4/8

Can be had from

Markazi Maktaba-e-Jamat-e-Islami

Ichhra L HO